جلد (۲) عدد (۳) ربیع الاول ۱۳۵۲ہجری
۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم و معارف قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ
سید ابو الاعلیٰ مودودی
باہتمام
مولوی ابو محمد صاحب مصلح

اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوا
قیمت سالانہ ؎ بیرون ہند کے لئے (؎) ۔ قیمت فی پرچہ ۸؍

خالی صفحه

فہرست مضامین

اِشارات

گذشتہ سال قدس شریف میں موتمر اسلامی کا جو اجتماع ہوا تھا اس کی تجاویز میں سب سے بہتر اور مبارک تجویز یہ تھی کہ اسلام کے قبلۂ اول میں تمام مسلمانانِ عالم کے لئے ایک جامعۂ اسلامیہ (مسلم یونیورسٹی) قائم کی جائے۔ اس تجویز کو عموماً پسند کیا گیا اور مصر و فلسطین میں اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک حرکت شروع ہو گئی تاتیک کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی تعلیمگاہ کے لئے ایک بڑی عمارت اور اس کے مصارف کیلئے ۸ ہزار پونڈ سالانہ کے اوقاف مل گئے ہیں لیکن ابھی کام شروع کرنے کے لئے مزید ۴۰۰۰۰ پونڈ کا انتظام ہونا ضروری ہے چنانچہ اس غرض کے لئے فلسطین کے مفتی اعظم مولانا الحاج امین الحسینی اور مصر کے سابق وزیر محمد علی پاشا علوبہ آجکل ہندوستان آئے ہوئے ہیں اور دیگر اسلامی ممالک میں بھی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس جامعۂ اسلامیہ میں تعلیم کا انتظام جس نہج پر ہوگا اس کی تفصیلات ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آئیں لیکن معزز وافدین نے اس کا جو مختصر خاکہ اپنے بیانات میں پیش کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سردست جامعہ کے چار شعبے ہوں گے - دینیات، طب، زراعت اور صنعت و حرفت۔

اگرچہ جامعہ مذکور کے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کی تفصیلات کا مطالعہ کئے بغیر محض اس مختصر بیان پر کوئی رائے ظاہر کرنا قبل از وقت ہوگا لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ان تفصیلات کے متعین ہونے سے پہلے چند باتیں اصول کے طور پر جامعۂ اسلامیہ کے موسسین اور ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کریں۔

جہانتک مسلمانان فلسطین کی مقامی ضروریات کا تعلق ہے ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے لئے نہ صرف ان شعبوں کا قائم

ہونا ضروری ہے جن کا ذکر معزز وافدین نے کیا ہے، بلکہ فنونِ ہندسہ، حقوق، اور اگر ممکن ہو تو فن حرب کے شعبے بھی قائم کرنے کی ضرورت ہوگی لیکن اس حیثیت سے اس جامعہ میں کوئی ایسی خصوصیت نہ ہوگی جس کی بنا پر وہ جامعہ اسلامیہ کہی جا سکے، اور تمام مسلمانانِ عالم کے لئے ایک علمی و فکری مرکز بن سکے۔ اسی طرح اگر اس میں شعبہ دینیات کی حیثیت بھی وہی ہو جیسی قاہرہ، حیدرآباد، دہلی اور علیگڈھ کی یونیورسٹیوں میں ہے تب بھی یہ اس مقصد کو پورا نہ کرسکے گی جس کی خاطر دنیائے اسلام کے لئے ایک مرکزی جامعہ اسلامیہ کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے، اور یہی کیفیت اس صورت میں بھی ہوگی کہ اس مجوزہ یونیورسٹی کا شعبہ دینیات عالم اسلامی میں دیوبند اور ازہر کی طرح کے ایک اور معہد علمی اسلامی کا اضافہ کردے۔ دراصل عالم اسلامی کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایک ایسی جامعہ ہے جو علوم اسلامیہ میں نئے سرے سے زندگی کی روح پھونک دے، سات صدیوں سے ان پر جمود اور خمود کی جو کیفیت طاری ہے اس کو دور کرے، ان میں حرکت اور نمو کی قوت پیدا کرے، اور ان کے نظام میں ایسی جان ڈال دے کہ جو لوگ ان کو پڑھ کر نکلیں وہ جامد اور ٹھوس مقلد نہ ہوں بلکہ اصحاب فکر و اجتہاد ہوں اور علمائے متاخرین کی طرح محض درس و افتا کے مسند نشین نہ ہوں، بلکہ فکر و عمل کے میدان میں مسلمانوں کے قائد و رہنما بن سکیں۔

اس وقت مسلمانوں کی جتنی یونیورسٹیاں دنیا میں قائم ہیں وہ سب بلاشبہ اپنے اپنے میدان میں کچھ نہ کچھ مفید کام کر رہی ہیں، لیکن وہ مسلمانوں کی اصلی ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو ان میں مغربی یونیورسٹیوں کی ہو بہو نقل اتارنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس بنا پر وہ اس تخیل، اس روح، اس قوت محرکہ اور اس ذہنیت سے خالی ہیں جو خالص اسلامی ہو، یا پھر وہ صدیوں پہلے کے اسلامی مدارس کے آثار باقیہ ہیں جن میں اسلامیت اس معنی میں تو ضرور ہے کہ ان کا ڈھانچا اسلامی طرز کا ہے، مگر وہ فکر و عمل کی روح سے خالی محض ایک بے جان ڈھانچہ ہے۔ پہلی قسم کی یونیورسٹیاں اس ٹکسال کی طرح ہیں جو دوسری ٹکسالوں کے سکے بناتی ہے، اور دوسری قسم کی یونیورسٹیاں اس ٹکسال کے مانند ہیں جو سکے تو اپنے ہی بناتی ہے، مگر ان کا چلن دنیا میں نہیں ہے۔ ہماری ضرورت ان دونوں ٹکسالوں سے پوری نہیں ہوتی کیونکہ ہمیں ضرورت ایسی ٹکسال کی ہے جو سکے بھی اپنے بنائے اور دنیا میں ان کا چلن بھی ہو۔ یہی منشا ہے جس کو حل کرنے کے لئے گذشتہ نصف صدی

سے مسلمانوں کے ارباب فکر کوشش کر رہے ہیں غور کیا جا رہا ہے کہ تعلیم کے ان دونوں طریقوں سے ہٹ کر کوئی ایسا طریقہ ایجاد کیا جائے جس کا ڈھانچہ بھی اسلامی ہو اور روح بھی اسلامی اور پھر اس کے ساتھ ہی اس میں وہ قوت محرکہ بھی ہو جو وقت کی رہنمائی کے لئے ضروری ہے کچھ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس سوال کا حل علوم جدیدہ اور علوم اسلامیہ کے ایک معتدل امتزاج میں ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے یہ رائے قائم کی کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم کو علوم جدیدہ کے طرز پر ڈھالا جائے۔ ان مختلف خیالات کے تحت اب تک مختلف تعلیمی تجربے ہو چکے ہیں اور ان سے نسبتہً بہتر نتائج بھی حاصل ہوئے ہیں لیکن اصلی مقصد جس کے لئے یہ تمام کوششیں کی جا رہی ہیں اب تک حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

جہاں تک علوم جدیدہ اور علوم اسلامیہ کی آمیزش کا تعلق ہے اس کے مفید اور ضروری ہونے میں کوئی کلام نہیں مگر ہمارے نزدیک صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم کے طرز میں بنیادی تغیر کیا جائے اور سرے سے پوری مشین کی ترتیب ہی کو بدل دیا جائے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم جدید طرز پر ہو جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے بلکہ ہمارا مقصد اس کے بالکل برعکس ہے ہم چاہتے ہیں کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم کو جس ڈھنگ پر متاخرین نے ڈال دیا ہے اس کو چھوڑ کر وہ ڈھنگ اختیار کیا جائے جو اسلام کی ابتدائی چار صدیوں میں رائج تھا اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آج اس چودھویں صدی میں ہم وہ طریق تعلیم اختیار کرنا چاہتے ہیں جو دوسری اور تیسری صدی کے مناسب حال تھا بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ ہمیں اسلامی علوم کی تعلیم کا وہ اصول اختیار کرنا چاہئے جس سے مجتہد پیدا ہوتے تھے اور وہ اصول ترک کر دینا چاہئے جس سے بعد میں مقلد پیدا ہونے لگے۔

یہ اصول کیا ہے؟ مختصر الفاظ میں اس کا بیان یہ ہے کہ ہمارے پورے نظام تعلیم کا مرکز اور مدار قرآن مجید ہونا چاہئے درس و تدریس کی اصلی غرض یہ ہو کہ ہمیں قرآن مجید کو سمجھنا ہے۔ اس کے معانی و مطالب تک رسائی حاصل کرنی ہے اس کے معارف و حقائق میں بصیرت پیدا کرنی ہے اس کو اپنے افکار اور اپنے تخیلات کا حقیقی رہنما بنانا ہے، اور

اپنی زندگی اس کے سانچے میں ڈھالنی ہے۔ عربی صرف و نحو، لغت و ادب، معانی و بیان کی تعلیم اسلئے ہو کہ کلام الٰہی کی عبارتوں کو سمجھا جائے۔ سیرت رسول، احادیث و آثار صحابہ و تابعین اور بزرگان اہل بیت کی سیرتوں اور ان کے اقوال کا تفحص اس لئے کیا جائے کہ رسول اکرم اور آپ کے سچے متبعین نے قرآن کو کس طرح سمجھا، کس طرح سمجھایا اور اپنی عملی زندگی میں اس کو کس طرح برتا۔ فقہا کے کلام اور ان کے اجتہادات میں اس نقطۂ نظر سے غور و خوض کیا جائے کہ ان سے وہ طریقے معلوم کئے جائیں جن پر عمل کر کے مشکوٰۃ نبوت سے اقتباس کرنے والوں نے مسائل کا استنباط کیا اور اصول سے فروع نکالے۔ مفسرین کی تقریروں اور متکلمین کی تاویلوں کا مطالعہ اس غرض سے کیا جائے کہ ان سے وہ تمام پہلو نظر میں آجائیں جو مختلف خیالات رکھنے والے اہل علم و تحقیق نے کتاب و سنت کی تعبیر میں اختیار کئے ہیں۔ سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات، قانون اور علوم عمرانی کا مطالعہ اس غرض سے کیا جائے کہ ہم اپنی زندگی کے مسائل میں کتاب و سنت کے مقرر کئے ہوئے اصول پر عمل کرنے کے صحیح طریقے متعین کر سکیں، اور اسلامی نظام تمدن کو ایک ایسا نظام بنا سکیں جو ساکن و جامد نہ ہو، بلکہ وقت اور زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا رہے۔ فلسفہ و منطق اور علوم عقلیہ کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے کہ افکار بشری میں انقلاب پیدا ہو، اور اسلامی فکر اور اسلامی تخیل دماغوں پر حکمران ہو جائے۔ غرض ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ہم ایک ایسا نظام تعلیم قائم کریں جس میں قرآن کی حیثیت ایک محور کی ہو اور یہ پورا نظام اسی محور پر گردش کرے۔ یہی ایک صورت ہے جس سے اسلامی تمدن نہ صرف زندہ کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کو دنیا کا غالب تمدن بنایا جا سکتا ہے۔

گذشتہ مہینے سے نواب بہادر یار جنگ بہادر نے ایک عمدہ تحریک شروع کی ہے جس کا چرچا حیدرآباد میں آہستہ آہستہ شروع ہو گیا ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ ہر شخص اپنے حلقۂ اثر میں قرآن مجید کی تعلیمات کو اشاعت دینے کی کوشش کرے اور نہ صرف خود اپنے اوقات کا ایک حصہ، خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، قرآن مجید کو سمجھنے میں صرف کرے، بلکہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو بھی اس طرف توجہ دلائے۔ نیز جن لوگوں کو وہ خود پڑھا سکتا ہو انھیں پڑھائے بھی۔ چاہے وہ

روزانہ ایک ہی آیت ہو۔ یہ دراصل وہی تحریک ہے جو قرن اول کے مسلمانوں میں رائج تھی، ہجرت کے بعد چند سال کے اندر اسلام جو آندھی اور طوفان کی طرح دنیا کے اطراف و اکناف میں پھیل گیا اس کے وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہر مسلمان اپنی دوسری حیثیات کیساتھ ایک مستقل حیثیت مبلغ اور معلم ہونے کی بھی رکھتا تھا قرآن کی تعلیم اس وقت مسجد کے ملا اور مکتب کے استاد جی کیلئے مختص نہ تھی اور نہ اسلام کی تبلیغ کیلئے واعظوں اور مبلغوں کا کوئی الگ پیشہ بنا تھا بلکہ مسلمان جہاں اور جس حیثیت میں بھی تھا معلم قرآن اور مبلغ اسلام تھا ضرورت ہے کہ اسی طریقے کو اب بھی اختیار کیا جائے اور ہر شخص فرداً فرداً کلام الٰہی کے پھیلانے کی کوشش کرے

کیا ہم امید کریں کہ دوسرے مقامات کے مسلمان بھی اس تحریک کو اشاعت دیں گے؟

مغرب کے نظام تمدن کو جو شدید امراض اس وقت لاحق ہیں ان میں سے ایک بڑا مرض عورتوں کا معاشی استقلال ہے اہل مغرب نے غلطی سے عورتوں اور مردوں کے درمیان مساوات پیدا کرنے کے معنی یہ سمجھے کہ جو کام مرد کریں وہی عورتیں بھی کریں۔ گذشتہ جنگ عظیم کی غیر معمولی ضروریات نے اس غلط نظریہ کو عملی صورت دیدی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کام عورتوں سے متعلق تھے ان کو چھوڑ کر وہ کارخانوں، بازاروں اور دفتروں میں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے لگیں یورپ اور امریکہ کے صنعتی ممالک اس وقت عائلی زندگی کی برہمی، ازدواجی تعلقات کے فقدان، مناکحت کی طرف عدم رجحان کی کمی معیار اخلاق کی پستی امراض خبیثہ کی خوفناک ترقی شرح پیدائش کے روز افزوں تنزل اور محنت پیشہ طبقوں کی بڑھتی ہوئی بیکاری کے جن گوناگوں خطرات میں مبتلا ہیں، ان کی براہ راست ذمہ داری عورتوں کے اسی معاشی استقلال پر عائد ہوتی ہے۔

بظاہر اس معاشی استقلال میں جو محاسن ہیں ان کو دیکھ کر اہل مشرق بھی مغرب کی تقلید کرنا چاہتے ہیں مگر شاید ان کو معلوم نہیں کہ مغرب کے عاقبت اندیش مدبر خود اس غلط نظام کی خرابیاں محسوس کر کے اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں! اس معاملہ میں اٹلی کے فرمانروا سینور مسولینی نے جو کچھ کیا ہے وہ مشہور ہے اب دوسری مثال جرمنی کے نئے چانسلر نے پیش کی ہے جرمنی کی تعمیر جدید کے لئے وہ جن تدابیر کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے ان میں سے

ایک یہ ہے کہ عورتوں کو ان کے فطری حدود عمل میں واپس کیا جائے چنانچہ حال میں جو قانون اس نے نافذ کیا ہے اس کی رو سے تمام غیر شادی شدہ مردوں و عورتوں پر ایک ٹیکس عائد کیا جائے گا۔ اور اس ٹیکس سے جو رقم جمع ہو گی اس سے ان لوگوں کو ضروریات خانہ داری مہیا کرنے میں مدد دیجائے گی جو شادی کرلیں گے، بشرطیکہ عورت یہ عہد کرے کہ جب تک اس کا شوہر کم از کم ۱۲۵ مارک ماہوار کماتا رہیگا اس وقت تک وہ کوئی ملازمت قبول نہ کریگی۔

امریکہ کی دولت مندی وخوشحالی پر دنیا میں رشک کیا جاتا ہے مگر خود اس ملک کے باشندے اپنے نظام تمدن کی بدولت جن مشکلات میں مبتلا ہیں ان کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کے اس سب سے زیادہ دولت مند ملک میں خودکشی کی رفتار تمام ممالک سے زیادہ بڑھ رہی ہے سنہ ۱۹۲۱ء میں وہاں (۲۰۰۰۰) آدمیوں نے اپنی زندگی کا خاتمہ کیا تھا سنہ ۱۹۳۲ء میں یہ تعداد (۲۳۰۰۰) تک پہنچ گئی گویا ایک سال میں تقریباً ۳ ہزار خودکشیوں کا اضافہ ہوا۔ اس کے قریب قریب انگلستان کا حال بھی ہے جہاں سنہ ۱۹۱۱-۲۰ء میں خودکشی کا اوسط ۸۰ فی ملین تھا سنہ ۱۹۲۵ء میں ۱۰۵ ہوا، اور سنہ ۱۹۳۱ء میں ۱۲۷ تک پہنچ گیا۔ ظاہر ہے کہ انسان اپنی ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ اسی حالت میں کرتا ہے جب اس کے لئے زندگی کے آلام ناقابل برداشت ہوجاتے ہیں، اور اس حالت میں بھی صرف وہی لوگ ایسا کرتے ہیں جن میں قوت تحمل کم ہوتی ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مغربی زندگی کے آلام کتنی کثیر آبادی کو پریشانیوں میں مبتلا کئے ہوئے ہوں گے جن میں سے چند ہزار آدمی ہر سال اپنے آپ کو خود ہلاک کر دینے کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں

یہ نتائج ہیں اس نظام تمدن کے جسے اختیار کرنے کے لئے ہماری قوم کے ارباب تجدد بیچین ہیں، مگر کیا انہوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ اسلامی تمدن کے انتہائی عروج کے زمانہ میں بھی کبھی اسلامی ممالک میں انسان پر عرصۂ حیات اتنا تنگ ہوا تھا کہ وہ دنیا سے بھاگ کر اس طرح موت کی آغوش میں پناہ لینے پر مجبور ہوتا؟ کیا اسلامی تاریخ کے کسی دور میں خودکشیوں کی اتنی کثرت یا اس سے کم کسی قابل لحاظ تعداد کا پتہ دیا جاسکتا ہے؟

اسلامی تہذیب اور اسکے اصول و مبادی

(۳)

زندگی کا اسلامی تصور

گذشتہ دو صحبتوں میں اسلام کے تصور حیات دنیا کی جو تحلیل کی گئی ہے اس سے وہ تمام اجزا آپ کے سامنے آگئے ہیں جن سے یہ تصور مرکب ہے۔ اب تحلیل و تجزیہ کے پہلو کو چھوڑ کر ترکیب و تالیف کے پہلو پر نظر ڈالئے اور یہ دیکھئے کہ ان متفرق اجزا کے ملنے سے جو کلی تصور حاصل ہوتا ہے وہ کس حد تک فطرت اور واقعہ کے مطابق ہے؟ اور دنیوی زندگی کے متعلق دوسری تہذیبوں کے تصورات کی نسبت سے اس کا کیا مرتبہ ہے؟ اور اس تصور حیات پر جس تہذیب کی بنیاد قائم ہے وہ انسان کے فکر و عمل کو کس سانچے میں ڈھالتی ہے؟

زندگی کا فطری تصور تھوڑی دیر کے لئے اپنے ذہن کو تمام ان تصورات سے جو دنیا اور حیات دنیا کے متعلق مختلف مذاہب نے پیش کئے ہیں خالی کر کے ایک مبصر کی حیثیت سے اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نگاہ ڈالئے اور غور کیجئے کہ اس پورے ماحول میں آپ کی حالت کیا ہے؟ اس مشاہدہ میں آپ کو چند باتیں واضح طور پر نظر آئیں گی۔

آپ دیکھیں گے کہ جتنی قوتیں آپ کو حاصل ہیں ان کا دائرہ محدود ہے۔ آپ کے حواس جن پر آپ کے علم کا انحصار ہے آپ کے قریبی ماحول کی حدود سے آگے نہیں بڑھتے۔ آپ کے جوارح جن پر آپ کے عمل کا انحصار ہے بہت تھوڑی سی اشیاء پر دسترس رکھتے ہیں۔ آپ کے گرد و پیش بے شمار ایسی چیزیں ہیں جو آپ سے جسم اور طاقت میں بڑھی ہوئی ہیں اور ان کے مقابلہ میں آپ کی ہستی نہایت حقیر اور کمزور نظر آتی ہے۔ دنیا کے اس بڑے کارخانے میں جو زبردست قوتیں کارفرما ہیں ان میں سے کوئی بھی آپ کے دستِ قدرت میں نہیں ہے اور آپ ان قوتوں کے مقابلہ میں اپنے

آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ جسمانی حیثیت سے آپ ایک متوسط درجے کی ہستی رکھتے ہیں جو اپنے سے چھوٹی چیزوں پر غالب اور اپنے سے بڑی چیزوں سے مغلوب ہے

لیکن ایک اور قوت آپ کے اندر ایسی ہے جس نے آپ کو ان تمام چیزوں پر شرف عطا کر دیا ہے۔ اسی قوت کی بدولت آپ اپنی جنس کے تمام حیوانات پر قابو پا لیتے ہیں اور ان کی جسمانی طاقتوں کو جو آپ کی جسمانی طاقت سے بہت بڑھی ہوئی ہیں مغلوب کر لیتے ہیں۔ اسی قوت کی بدولت آپ اپنے گرد و پیش کی چیزوں میں تصرف کرتے ہیں اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق خدمت لیتے ہیں۔ اسی قوت کی بدولت آپ طاقت کے نئے نئے خزانوں کا پتہ چلاتے ہیں اور ان کو نکال کر نئے نئے طریقوں سے استعمال کرتے ہیں۔ اسی قوت کی بدولت آپ اپنے وسائلِ اکتساب علم کو وسعت دیتے ہیں اور ان چیزوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں جو آپ کے طبیعی قویٰ کی دست رس سے باہر ہیں۔ غرض ایک قوت ہے جس کی بدولت تمام دنیا کی چیزیں آپ کی خادم بن جاتی ہیں اور آپ ان کے مخدوم ہونے کی حیثیت حاصل کرتے ہیں۔

پھر کیا نگاہ ہی کی وہ بالاتر قوتیں بھی جو آپ کے دست قدرت میں نہیں ہیں اس ڈھنگ پر کام کر رہی ہیں، کہ بالعموم وہ آپ کی دشمن و مخالف نہیں بلکہ آپ کی مددگار اور آپ کے مفاد و مصلحت کی تابع ہیں۔ ہوا، پانی، روشنی، حرارت، اور ایسی ہی دوسری قوتیں جن پر آپ کی زندگی کا انحصار ہے کسی ایسے نظام کے ماتحت عمل کر رہی ہیں جس کا مقصد آپ کی مساعدت کرنا ہے اور اسی بنا پر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ سب آپ کے لئے مسخر ہیں۔

اپنے اس ماحول پر جب آپ ایک عمیق نگاہ ڈالتے ہیں تو آپ کو ایک زبردست قانون کارفرما نظر آتا ہے جس کی گرفت میں حقیر ترین ہستیوں سے لیکر عظیم ترین ہستیاں تک یکساں جکڑی ہوئی ہیں، اور جس کے ضبط و نظم پر تمام عالم کے بقا کا انحصار ہے۔ آپ خود بھی اس قانون کے تابع ہیں، مگر آپ میں اور دوسری اشیاء عالم میں ایک بڑا فرق ہے۔ دوسری تمام چیزیں اس قانون کے خلاف حرکت کرنے پر ذرہ برابر قدرت نہیں رکھتیں لیکن آپ کو اس کے خلاف چلنے کی قدرت حاصل ہے یہی نہیں بلکہ جب آپ اس کے خلاف چلنا چاہتے ہیں تو وہ قانون اس خلاف ورزی میں بھی آپ کی مساعدت کرتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر ایسی خلاف ورزی اپنے ساتھ کچھ مضرتیں رکھتی ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ آپ اس کی مخالفت کرنے

کے بعد اس کے برے اثرات سے بچ جائیں۔

اس عالمگیر اور شامل قانون کے تحت دنیا میں کون و فساد کے مختلف مظاہر آپ کو نظر آتے ہیں۔ تمام عالم میں بننے اور بگڑنے کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ جس قانون کے تحت ایک چیز کو پیدا اور پرورش کیا جاتا ہے اسی قانون کے تحت اس کو مٹایا اور ہلاک بھی کر دیا جاتا ہے۔ دنیا کی کوئی شے اس قانون کے نفاذ سے محفوظ نہیں ہے۔ بظاہر جو چیزیں اس سے محفوظ نظر آتی ہیں اور جن پر استمرار و دوام کا شبہ ہوتا ہے ان کو بھی جب آپ تعمق کی نظر سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حرکت و تغیر کا عمل ان میں بھی جاری ہے۔ اور کون و فساد کے چکر سے ان کو بھی نجات حاصل نہیں ہے۔ چونکہ کائنات کی دوسری چیزیں شعور و ادراک نہیں رکھتیں، یا کم از کم ہم کو اس کا علم نہیں ہے کہ ان میں شعور و ادراک ہے یا نہیں، اس لئے ہم ان کے اندر اس بننے اور بگڑنے سے کسی لذت و الم کا اثر محسوس نہیں کرتے اور اگر انواع حیوانی میں اس کا اثر محسوس ہوتا بھی ہے تو وہ بہت محدود ہوتا ہے۔ لیکن انسان جو ایک صاحب شعور و ادراک ہستی ہے اپنے گرد و پیش ان تغیرات کو دیکھ کر لذت اور الم کے شدید اثرات محسوس کرتا ہے۔ کبھی مناسب طبع امور سے اس کی لذت اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ وہ اس کو بھول جاتا ہے کہ اس دنیا میں فساد بھی ہے اور کبھی مخالف طبع امور سے اس کا الم اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ اس دنیا میں اسے نرا فساد ہی فساد نظر آنے لگتا ہے، اور وہ بھول جاتا ہے کہ یہاں کون بھی ہے۔

مگر خواہ آپ کے اندر لذت اور الم کے کیسے ہی متضاد احساسات ہوں اور ان کے زیر اثر دنیوی زندگی سے متعلق آپ کا نظریہ کتنا ہی افراط یا تفریط کی طرف مائل ہو، بہرحال آپ اپنی جبلت سے مجبور ہیں کہ اس دنیا کو جیسی بھی یہ ہے، عملاً برتیں اور ان قوتوں سے جو آپ کے اندر موجود ہیں کام لیں۔ آپ کی جبلت میں زندہ رہنے کی خواہش موجود ہے اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے آپ کے اندر بھوک کی ایک زبردست قوت رکھ دی گئی ہے جو دائماً آپ کو عمل پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ فطرت کا قانون آپ کی نوع کے استمرار کے لئے آپ سے خدمت لینا چاہتا ہے اور اس کے لئے اس نے شہوت کی ایک ناقابل دفع قوت آپ کے اندر رکھ دی ہے جو آپ سے اپنا مقصد پورا کرا کے ہی چھوڑتی ہے۔ اسی طرح آپ کی جبلت میں کچھ دوسرے مقاصد کے لئے کچھ اور قوتیں بھی رکھ دی گئی ہیں اور یہ سب آپ سے زبردستی اپنا کام لیتی ہیں۔ اب یہ آپ کی اپنی

فراست ودانائی پر موقوف ہے کہ فطرت کے ان مقاصد کی خدمت اچھے طریقے سے انجام دیں یا برے طریقے سے بطیب نفس انجام دیں یا بجبر واکراہ یہی نہیں بلکہ خود فطرت ہی نے مخصوص طور پر آپ کو یہ قدرت بھی عطا کی ہے کہ ان مقاصد کی خدمت انجام دیں یا نہ دیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس فطرت کا قانون یہ بھی ہے کہ اس کی خدمت بجالانا اور اچھے طریقے سے بطیب نفس بجالانا آپ کے لئے مفید ہوتا ہے اور اگر آپ اس سے رُو گردانی کریں۔ یا اگر اس کی متابعت کریں بھی تو بری طرح کریں تو یہ خود آپ ہی کے لئے مضر ہوتا ہے۔

مختلف مذاہب کے تصورات | ایک صحیح الفطرت اور وسیع النظر آدمی جب دنیا پر نظر ڈالے گا اور اس دنیا کی نسبت سے اپنی حالت پر غور کرے گا، تو وہ تمام پہلو اس کی نگاہ کے سامنے آجائیں گے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں لیکن نوع انسانی کے مختلف گروہوں نے اس مرقع کو مختلف گوشوں سے دیکھا ہے، اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ جس کو جو پہلو نمایاں نظر آیا، اس نے حیات دنیا کے متعلق اسی پہلو کے لحاظ سے ایک نظریہ قائم کرلیا، اور دوسرے پہلوؤں پر نگاہ ڈالنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

مثال کے طور پر ایک گروہ نے انسان کی کمزوری اور بے بسی اور اس کے مقابلہ میں فطرت کی بڑی بڑی طاقتوں کی شوکت و جبروت کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ دنیا میں وہ ایک نہایت ہی حقیر ہستی ہے اور یہ نافع و ضار قوتیں جو دنیا میں نظر آتی ہیں کسی عالمگیر قانون کی تابع نہیں ہیں بلکہ خود مختار یا نیم خود مختار طاقتیں ہیں۔ یہ تخیل ان کے ذہن پر اتنا غالب ہوا کہ وہ پہلو جس سے تمام کائنات پر انسان کو شرف و مزیت حاصل ہے، ان کی نظروں سے اوجھل ہوگیا وہ اپنی ہستی کے روشن پہلو کو بھول گئے، اور اپنی عزت و بزرگی کے احساس کو انہوں نے اپنی کمزوری و ناتوانی کے مبالغہ آمیز اعتراف پر قربان کردیا۔ بت پرستی، شجر پرستی، ستارہ پرستی اور دوسرے قوائے فطرت کی پرستش اسی نظریہ کی پیداوار ہے۔

ایک دوسرے گروہ نے دنیا کو اس نظر سے دیکھا کہ اس میں بس فساد ہی فساد ہے تمام کارخانۂ ہستی اس لئے چل رہا ہے کہ انسان کو تکلیف، رنج، الم پہنچائے۔ دنیا کے جتنے تعلقات اور روابط ہیں سب انسان کو پریشانیوں اور مصیبتوں میں پھانسنے والے پھندے ہیں! ایک انسان پر ہی کیا موقوف ہے تمام کائنات فسردگی اور ہلاکت کے پنجے میں گرفتار ہے

یہاں جو کچھ بنتا ہے بگڑنے کے لئے بنتا ہے۔ بہار اس لئے آتی ہے کہ خزاں اس کا چمن لوٹ لے، زندگی کا شجر اس لئے برگ و بار لاتا ہے کہ موت کا عفریت اس سے لطف اندوز ہو، بقا کا جمال سنور سنور کر اس لئے آتا ہے کہ فنا کے دیوتا کو اس سے کھیلنے کا خوب موقع ملے اس تخیل نے ان لوگوں کے لئے دنیا اور اس کی زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہ چھوڑی اور انہوں نے اپنے لئے نجات کی راہ بس اسی میں دیکھی کہ دنیا سے کنارہ کش ہو جائیں، نفس کشی اور ریاضت سے اپنے تمام حسیات کو باطل کر دیں اور فطرت کے اس ظالم قانون کو توڑ ڈالیں جس نے محض اپنے کارخانے کو چلانے کے لئے انسان کو آلۂ کار بنایا ہے۔

ایک اور گروہ نے دنیا کو اس نظر سے دیکھا کہ اس میں انسان کے لئے لذت و عیش کے سامان فراہم ہیں اور اس کو ایک تھوڑی سی مدت ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے مل گئی ہے تکلیف اور الم کا احساس ان لذتوں کو بدمزہ کر دیتا ہے اگر انسان اس احساس کو باطل کر دے اور کسی چیز کو اپنے لئے موجب الم اور باعث تکلیف نہ رہنے دے تو پھر یہاں لطف ہی لطف ہے، اس کے لئے جو کچھ بھی ہے یہی دنیا ہے اور اس کو جو کچھ مزے اڑانے ہیں اسی دنیوی زندگی میں اڑانے ہیں، موت کے بعد نہ وہ ہوگا نہ دنیا ہوگی نہ اس کی لذتیں ہوں گی، سب کچھ نسیاً منسیا ہو جائیگا۔

اس کے مقابلہ میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو دنیا اور اس کی لذتوں اور مسرتوں بلکہ خود دنیوی زندگی ہی کو سراسر گناہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی روح کے لئے دنیا کی مادی آلائشیں ایک نجاست اور ایک ناپاکی کا حکم رکھتی ہیں اس دنیا کو برتنے اور اس کے کاروبار میں حصہ لینے اور اس کی لذتوں اور مسرتوں سے لطف اندوز ہونے میں انسان کے لئے کوئی پاکیزگی اور کوئی صلاح اور خیر نہیں ہے۔ جو شخص آسمانی بادشاہت سے بہرہ مند ہونا چاہتا ہو اسے دنیا سے الگ تھلگ رہنا چاہئے اور جو دنیا کی دولت، حکومت اور دنیوی زندگی کا لطف اٹھانا چاہتا ہو اسے یقین رکھنا چاہئے کہ آسمانی بادشاہت میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے۔ پھر جب اس گروہ نے محسوس کیا کہ انسان اس دنیا کو برتنے اور اس کے دھندوں میں پھنسنے کے لئے اپنی جبلت سے مجبور ہے اور آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے کا خیال خواہ کتنا ہی دلفریب ہو، مگر وہ اتنا قوی نہیں ہو سکتا کہ انسان اس کے بل پر اپنی فطرت کے اقتضاء کا مقابلہ

کر سکے، تو انہوں نے آسمانی بادشاہت تک پہنچنے کے لئے ایک قریب کا راستہ نکال لیا، اور وہ یہ تھا کہ ایک ہستی کے کفارے نے ان سب لوگوں کو ان کے اعمال کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا ہے جو اس ہستی پر ایمان لائیں۔

ایک اور گروہ نے قانون فطرت کی ہمہ گیری کو دیکھ کر انسان کو ایک مجبور محض ہستی سمجھ لیا۔ اس نے دیکھا کہ نفسیات، عضویات، حیاتیات اور قانون توریث کی شہادتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان ہرگز کوئی مرید و مختار ہستی نہیں ہے فطرت کے قانون نے اس کو بالکل جکڑ رکھا ہے وہ اس قانون کے خلاف نہ کچھ سوچ سکتا ہے۔ نہ کسی چیز کا ارادہ کر سکتا ہے، اور نہ کوئی حرکت کرنے پر قادر ہے۔ لہذا اس پر اپنے کسی فعل کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ۔

اس کے بالکل برعکس ایک گروہ کی نگاہ میں انسان نہ صرف ایک صاحب ارادہ ہستی ہے بلکہ وہ کسی بالاتر ارادہ کا تابع، اور کسی اعلیٰ طاقت کا مطیع و فرمانبردار نہیں ہے اور نہ اپنے اعمال و افعال میں خود اپنے ضمیر یا انسانی حکومت کے قانون کے سوا کسی کے آگے جواب دہ ہے۔ وہ اس دنیا کا مالک ہے۔ دنیا کی سب چیزیں اس کے لئے مسخر ہیں اسے اختیار ہے کہ ان کو جس طرح چاہے برتے۔ اس نے اپنی زندگی کو بہتر بنانے اور اپنے اعمال و افعال میں ایک ضبط و نظم پیدا کرنے کے لئے اپنی حیات انفرادی پر خود کچھ پابندیاں عاید کر لی ہیں مگر اجتماعی حیثیت سے وہ بالکل مطلق العنان ہے اور کسی بالاتر ہستی کے آگے مسئول ہونے کا تخیل مذہب نغو ہے۔

یہ دنیوی زندگی کے متعلق مختلف مذاہب فکر و رائے کے مختلف تصورات ہیں اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن پر مختلف تہذیبوں کی عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں۔ ہر تہذیب کی عمارت میں جو مختلف طرز و انداز ہم کو نظر آ رہے ہیں ان کے ایک مخصوص اور جداگانہ ہیئت اختیار کرنے کی اصلی وجہ یہی ہے کہ انکی بنیادیں دنیوی زندگی کا ایک خاص تصور ہے جو اس مخصوص ہیئت کا مقتضی ہوا ہے۔ اگر ہم ان میں سے ہر ایک کی تفصیلات پر نظر ڈال کر یہ تحقیق کریں کہ اس نے کس طرح ایک خاص طرز و انداز کی تہذیب پیدا کی ہے تو یہ یقیناً ایک دلچسپ بحث ہوگی لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہے کیونکہ ہم صرف اسلامی تہذیب کی خصوصیات کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ

زندگی کے یہ جتنے تصورات آپ کے سامنے بیان ہوئے ہیں، سب دنیا کو ایک خاص گوشۂ نظر سے دیکھنے کا نتیجہ ہیں۔ ان میں سے کوئی تصور ایسا نہیں ہے جو مجموعی حیثیت سے تمام کائنات پر ایک کلی نگاہ ڈالنے اور موجودات عالم میں انسان کی صحیح حیثیت متعین کرنے کے بعد قائم کیا گیا ہو، اور یہی وجہ ہے کہ ہر تصور ہماری نظر میں باطل ہو جاتا ہے جب ہم اس کے زاویۂ نگاہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے دنیا کو دیکھتے ہیں، اور پھر دنیا کے کلی ملاحظہ کے بعد ان تمام تصورات کی غلطی ہم پر روشن ہو جاتی ہے۔

اسلامی تصور کی خصوصیت

اب یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ زندگی کے تمام تصورات میں صرف اسلام ہی کا تصور ایک ایسا تصور ہے جو فطرت اور حقیقت کے مطابق ہے، اور جس میں دنیا اور انسان کے تعلق کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ نہ تو دنیا کوئی ترک اور نفرت کے قابل چیز ہے اور نہ ایسی چیز ہے کہ انسان اس کا فریفتہ ہو اور اس کی لذتوں میں گم ہو جائے۔ نہ وہ سراسر کون ہے، نہ سراسر فساد۔ نہ اس سے اجتناب درست ہے، اور نہ اس میں کلی انہماک صحیح۔ نہ وہ بالکل نجاست و آلودگی ہے، اور نہ تمام تر پاکیزگی و طہارت۔ پھر اس دنیا سے انسان کا تعلق نہ اس قسم کا ہے جیسا ایک بادشاہ کا اپنی مملکت سے ہوتا ہے اور نہ اس قسم کا جیسا ایک قیدی کا اپنے قید خانے سے۔ نہ انسان اتنا حقیر ہے کہ دنیا کی ہر قوت اس کی مسجود ہو، اور نہ اتنا غالب و قاہر ہے کہ وہ دنیا کی ہر شے کا مسجود بن جائے۔ نہ وہ اتنا بے بس ہے کہ اس کا ذاتی ارادہ کوئی چیز ہی نہ ہو، اور نہ اتنا طاقتور ہے کہ بس اسی کا ارادہ سب کچھ ہو۔ نہ وہ عالم ہستی کا مطلق العنان فرمانروا ہے، اور نہ کروروں آقاؤں کا بیچارہ غلام۔ حقیقت جو کچھ ہے وہ ان مختلف اطراف و نہایات کے درمیان ایک متوسط حالت ہے۔

یہاں تک تو فطرت اور عقل سلیم ہماری رہنمائی کرتی ہے لیکن اسلام اس سے آگے بڑھتا ہے اور اس امر کا ٹھیک ٹھیک تعین کرتا ہے کہ دنیا میں انسان کا حقیقی مرتبہ کیا ہے؟ انسان اور دنیا کے درمیان کس نوع کا تعلق ہے؟ اور انسان دنیا کو برتے تو کیا سمجھ کر برتے؟ وہ یہ کہہ کر انسان کی آنکھیں کھول دیتا ہے کہ تو عام مخلوقات کی طرح نہیں ہے بلکہ روئے زمین پر رب العالمین کا ذمہ دار وائسرائے ہے۔ دنیا اور اس کی طاقتوں کو

تیرے لئے مسخر کیا گیا ہے، تو سب کا حاکم اور ایک کا محکوم ہے سب کا فرماں روا اور صرف ایک کا تابع فرمان ہے تجھے تمام مخلوقات پر عزت و شرف حاصل ہے مگر عزت کا صحیح استحقاق تجھے اس وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ جب تو اس کا مطیع اور فرماں بردار رہو اور اس کے احکام کا اتباع کرے جس نے تجھے نیابت کا منصب عطا کر کے دنیا پر شرف بخشا ہے دنیا میں تو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اس کو برتے اور اس میں تصرف کرے پھر تو اس دنیا کی زندگی میں جس طرح صحیح یا غلط عمل کریگا اس پر وہ اچھے یا برے نتائج مترتب ہوں گے جنھیں تو بعد کی زندگی میں دیکھے گا۔ لہٰذا دنیوی زندگی کی اس تھوڑی سی مدت میں تجھ کو اپنی شخصی ذمہ داری اور مسئولیت کا ہر لمحہ احساس رہنا چاہیے اور کبھی اس سے غافل نہ ہونا چاہئے کہ جو چیزیں رب العالمین نے اپنے نائب کی حیثیت سے تیری امانت میں دی ہیں ان سب کا تجھ سے پورا پورا حساب لیا جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تصور اپنے جزئیات کے ساتھ ہر مسلمان کے ذہن میں حاضر نہیں ہے، اور نہ اہل علم کے مخصوص گروہ کے سوا کوئی ان جزئیات کا واضح ادراک رکھتا ہے لیکن چونکہ یہ تصور اسلامی تہذیب کی بیخ و بنیاد میں ممکن ہے اس لئے مسلمان کی سیرت اپنی اصلی شان اور اپنی حقیقی خصوصیات سے بہت کچھ عاری ہو جانے کے باوجود آج بھی اس کے اثرات سے خالی نہیں ہے ایک مسلمان جس نے اسلامی تہذیب کے ماحول میں تربیت پائی ہو اس کا عمل خواہ بیرونی اثرات سے کتنا ہی ناقص ہو گیا ہو، لیکن خودداری و عزت نفس کا احساس خدا کے سوا کسی کے آگے نہ جھکنا خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرنا خدا کے سوا کسی کو اپنا مالک اور آقا نہ سمجھنا دنیا میں اپنے آپ کو شخصاً مسئول سمجھنا۔ دنیا کو دار العمل اور آخرت کو دار الجزا سمجھنا صرف اپنے ذاتی اعمال کے حسن و قبح پر اپنی آخرت کی کامیابی و ناکامی کو منحصر سمجھنا دنیا اور اس کی دولت و لذت کو ناپائیدار اور صرف اپنے اعمال اور ان کے نتائج کو باقی و دائم خیال کرنا، یہ ایسے امور ہیں جو اس کے رگ و پے میں اتر گئے ہوئے ہوں گے اور ایک عمیق النظر مبصر اس کی باتوں اور اس کی حرکات و سکنات میں اس عقیدے کے اثرات کو (خواہ وہ کتنے ہی دھندلے کیوں نہ ہوں) صاف محسوس کرے گا جو اس کی روح اور اس کے دل کی گہرائیوں میں اترے ہوئے ہیں

پھر جو شخص تہذیب اسلامی کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا اسے یہ بات نمایاں طور پر محسوس ہوگی کہ اس میں

جب تک خالص اسلامیت رہی اس وقت تک یہ ایک خالص ثالثی تہذیب تھی۔ اس کے پیرؤں کے نزدیک دنیا آخرت کی کھیتی تھی اور وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ دنیا میں جتنی مدت وہ زندہ رہیں اس کا ہر لمحہ اس کھیتی کے بونے اور جوتنے میں صرف کردیں اور زیادہ سے زیادہ تخم ریزی کریں تاکہ بعد کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ فصل کاٹنے کا موقع ملے انہوں نے رہبانیت اور مادیت کے درمیان ایک ایسی معتدل و متوسط حالت میں دنیا کو برتا جس کا نام و نشان بھی ہم کو کسی دوسری تہذیب میں نظر نہیں آتا۔ خلافت الٰہی کا تصور ان کو دنیا میں پوری طرح منہمک ہونے اور اس کے معاملات کو انتہائی سرگرمی کے ساتھ انجام دینے پر ابھارتا تھا، اور اس کے ساتھ مسئولیت اور ذمہ داری کا خیال انہیں حد سے متجاوز بھی نہ ہونے دیتا تھا۔ وہ نائب خدا ہونے کی وجہ سے انتہا درجہ کے خوددار تھے، اور یہی تصور ان میں تکبر اور غرور کی پیدائش کو روکتا بھی تھا۔ وہ خلافت کے فرائض انجام دینے کے لئے ان تمام چیزوں کی طرف رغبت رکھتے تھے جو ذہب کا کام چلانے کے لئے ضروری ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی ان چیزوں کی طرف ان کو کوئی رغبت نہ تھی جو دنیا کی لذتوں میں گم کرکے انسان کو اس کے فرائض سے غافل کردینے والی ہیں۔ غرض وہ دنیا کے کام کو اس طرح چلاتے تھے کہ گویا ان کو ہمیشہ یہیں رہنا ہے، اور پھر اس کی لذتوں میں منہمک ہونے سے اس طرح بچے رہتے تھے کہ گویا یہ دنیا ان کے لئے ایک سرائے ہے جہاں محض عارضی طور پر وہ مقیم ہوگئے ہیں۔

لیکن جب اسلامیت کا اثر کم ہوگیا اور دوسری تہذیبوں سے متاثر ہوکر مسلمانوں کی سیرت میں پوری اسلامی شان باقی نہیں رہی تو انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو دنیوی زندگی کے اسلامی تصور کے خلاف تھا۔ عیش و عشرت میں منہمک ہوئے، عالیشان قصر تعمیر کئے، موسیقی، مصوری، سنگ تراشی اور دوسرے فنون لطیفہ میں دلچسپی لی، معاشرت اور رہن سہن اور بودوماند میں اس اسراف اور اس شان و شکوہ کو اختیار کیا جو اسلامی مذاق کے بالکل خلاف تھی، اور حکومت و سیاست اور دوسرے دنیوی معاملات میں وہ طریقے اختیار کرلئے جو بالکل غیر اسلامی تھے۔ مگر اس کے باوجود دنیوی زندگی کا اسلامی تصور جو ان کے دل میں اترا ہوا تھا کہیں نہ کہیں اپنا اثر نمایاں کرکے رہتا تھا، اور یہی اثر ان کے اندر دوسروں کے مقابلے میں ایک امتیازی شان پیدا کردیتا تھا۔ ایک مسلمان بادشاہ جمنا کے کنارے ایک عالیشان قصر

تعمیر کرتا ہے اور اس میں لطف و تفریح اور شان و شوکت کے وہ تمام سامان فراہم کرتا ہے جن کا انسان اس زمانہ میں تصور کرسکتا تھا مگر اس قصر کی سب سے زیادہ پر لطف تفریح گاہ میں پشت کی جانب (یعنی قبلہ کے رخ پر) یہ رباعی بھی کندہ کرتا ہے:

اے بندپای قفل بر دل ہشدار   وے دوختہ چشم و پائے در گل ہشدار
عزم سفر مغرب درو در مشرق   اے راہ رو پشت بمنزل ہشدار

وہ قصر اپنی جگہ بے نظیر نہیں ہے، اس سے بہتر قصر دنیا کی دوسری قوموں میں مل سکتے ہیں، مگر اس تخیل کی مثال دنیا کی کسی قوم میں نہیں مل سکتی جو روئے زمین پر فردوس بنانے والے کو "اے راہ رو پشت بمنزل ہشدار" کی تنبیہ کرتا ہے

اسلامی تاریخ میں اس قسم کی مثالیں بکثرت ملیں گی کہ قیصر و کسریٰ کے نمونوں پر بادشاہی کرنے والوں نے بھی جب کسی دشمن پر فتح پائی تو اپنی کبریائی کا اظہار کرنے کے بجائے خدائے واحد کے سامنے خاک پر سربسجود ہوگئے، بڑے بڑے جابر و گردن کش فرمان رواؤں نے جب شریعت اسلامی کے خلاف عمل کرنا چاہا تو کسی بندۂ خدا نے ان کو برملا ٹوک دیا اور وہ خوف خدا سے کانپ اٹھے، انتہا درجہ کے بدعمل اور بدسیرت لوگوں کو کسی ایک معمولی بات سے تنبیہ ہوگئی اور دفعتہً ان کی زندگی کا رنگ بدل گیا۔ دولت دنیا پر جان فدا کرنے والوں کے دل میں دنیا کی ناپائیداری اور آخرت کے حساب کتاب کا خیال آیا اور انہوں نے خدا کے بندوں پر سب کچھ تقسیم کرکے ایک مقصد زندگی اختیار کرلی۔ غرض ان تمام غیر اسلامی اثرات کے باوجود جو مسلمانوں کی زندگی میں پھیل گئے ہیں، آپ کو ہر قدم پر ان کی قومی سیرت میں اسلامی تصور کا جلوہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور نظر آئے گا، اور اس کو دیکھ کر آپ ایسا محسوس کریں گے کہ گویا اندھیرے میں دفعتاً روشنی نمودار ہوگئی۔

باغ جنت

از

مولانا عبد اللہ العمادی

(۴)

دوسری تنقیح هُمْ فِيهَا خَالِدُوْنَ۔ یعنے اہل جنت ہمیشہ اسی میں رہیں گے ہیں خلود (ہمیشگی) پر بڑا زور دیا گیا ہے کہ آیت میں جنت سے اگر جنت دنیا مراد ہوتی تو اس میں ہمیشگی کی شرط کیوں کیجاتی۔ دنیا تو خود ناپائیدار ہے پھر اس کی نعمتیں کیونکر پائدار رہ سکتی ہیں لیکن اصل میں یہ ایک طرح کی غلط فہمی ہے خلود کے معنی بقائے دوام کے نہیں ہیں بقائے طویل کے ہیں[1] امام رازی فرماتے ہیں۔

قَال اصحابنا الخلد هو الثبات الطويل سواءً دام او لم يدم واحتجوا فيه بالآية والعرف اما الآية فقوله تعالى خُلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ولو كَانَ التابيد داخلاً في مفهوم الخلد لكان ذالكَ تكرارًا واما العرف فيقال حبس فلان فلانًا حبسًا مخلدًا ولانهٗ يكتب في صكوك الاوقاف وقف فلان وقفًا مخلدًا[2]

ہمارے علما کہتے ہیں کہ خلود ہمیشگی کے معنے دیر تک پائدار رہنا ہے چاہے ہمیشہ ہمیشہ رہے یا نہ رہے اس باب میں قرآن و محاورہ عرب کی دلیل لاتے ہیں قرآن کی دلیل تو یہ ہے کہ بہشت میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہینگے بقائے دوام کے معنی اگر ہمیشگی کے مفہوم ہوتے تو دوبار ہمیشہ ہمیشہ کہنا کیا ضرور تھا محاورہ میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں کو ہمیشہ کے لیے بند رکھا ہے اور وقف ناموں میں لکھتے ہیں فلاں شخص نے ہمیشہ کیلئے جائداد وقف کی ہے حالانکہ دنیا اور اسکی کوئی چیز بھی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے

[1] سراج المنیر (طبع خیریہ مصر) صفحہ ۳۲ جلد ۱۔ [2] تفسیر کبیر جلد ۱ صفحہ ۲۳۵،

قاضی بیضاوی لکھتے ہیں۔

اَلخلد والخلود فی الاصل الثبات المدید دام او لم یدم ولذالک قیل للاثانی والاحجار خوالد وللجزء الذی یبقی من الانسان علی حالہ مادام حیًّا خلد ×× بخلاف مالو وضع للاعم منہ فاستعمل فیہ بذالک الاعتبار کاطلاق الجسم علی الانسان مثل قولہ تعالیٰ "وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ" لے	خلد اور خلود اصل میں دیر تک ثابت رہنے کو کہتے ہیں چاہے یہ کیفیت دوامی ہو یا نہ ہو اسی لئے چولھے اور پتھروں کو بھی خوالد (ہمیشہ رہنے والے) کہتے ہیں اور انسان کے جسم کا وہ جزو جو جب تک وہ باقی رہتا ہے اسے بھی خلد کہا جاتا ہے ×× لیکن جہاں کہیں عام ترین معنے کے لئے یہ لفظ رکھا گیا ہو وہاں اسی اعتبار سے استعمال بھی ہوتا ہے مثلاً یہ آیت ہم نے تجھ سے پہلے کسی شخص کیلئے ہمیشگی نہیں بنائی ہے لہ

نظام نیشاپوری نے لفظ خلد کے معنے بقائے دوام کے ہونے کے متعلق یہ بھی تشریح کی ہے کہ صرف معتزلہ نے خلد و خلود کے معنے بقائے دوام کے لئے ہیں ورنہ اشاعرہ اہل سنت کا اتفاق ہے کہ اس کے معنے دیر تک ثابت رہنے کے ہیں۔ بایں ہمہ اس ضمن میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ خلود کے معنی بقائے دوام نہ سہی مگر دراصل جنت میں بقائے دوام ہی ہوگا اس تاویل کی ضرورت یہ تھی کہ جس کو بہشت نصیب ہوگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نصیب ہوگی لیکن سوال یہ ہے کہ جب قرآن نے جنت کو باغ دنیا کیلئے بھی استعمال کیا ہے اور خلود کے معنی بھی بقای دوام کے نہیں ہیں تو پھر ان تاویلات کی کیا حاجت ہے؟ اور کیا ضرور ہے کہ اس دنیاوی جنت کی نعمتوں کو بھی روحانی مانا جائے جسمانی نہ مانا جائے؟

اس بیان توضیحی کا نتیجہ یہ ہے :—

لے انوار التنزیل واسرار التاویل للقاضی البیضاوی (علی ہامش السراج المنیر) جلد ۱ صفحہ ۹۳۔

لہ غرائب القرآن ورغائب الفرقان للنظام النیسابوری (علی ہامش جامع البیان لابن جریر الطبری) جلد ۱ صفحہ ۱۹۴۔

(الف) آیت میں مہذب صالح مسلمانوں کو بشارت دی گئی ہے اور اس بشارت سے پہلے شرط کر دی گئی ہے کہ ان میں اسلامی تقوی و تہذیب (کہ حقیقت میں وہی ایک تہذیب ہے) و شائستگی و صلاحیت ہونا ضروری ہے۔

(ب) مدعای بشارت یہ ہے کہ جو مسلمان صالح و نیک کردار اور شریفانہ اخلاق سے آراستہ ہوں گے خدا ان کو جنت اور اس کی نعمتیں عطا کرے گا۔

(ج) یہ دور ترقی بہت دیر تک قائم رہے گا! اور اسی لحاظ سے اس کو خالد کہا جائے گا۔

(۵)

یہ تمہید تھی۔ ناظرین اب اس کے بعد منشا آیت ملاحظہ فرمائیں۔

آیت میں اسلامی ترقی کے وعدے کو ایمان عمل صالح سے مشروط کیا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ایمان کے معنی کیا ہیں۔ ایمان یہ نہیں ہے کہ زبان تو لا الٰہ الا اللہ کہہ رہی ہو اور دل میں ؎

صنمے در دل ما یافت راہ نحن لا نعبد الا ایاہ

کے ناپاک جذبات بھرے ہوں کہنے کو اپنے تئیں مسلمان کہا جائے مگر اسلام کے احکام سے عملاً کچھ علاقہ نہ ہو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جگہ رسم و رواج کو دیجائے اور مذہبی و قومی پیشوائی کی منزل جو پہلے قرآن کریم کو اور صرف قرآن کریم کو حاصل تھی اب علماء کے قیاسات و مفروضات کو عطا کی جائے۔ ایمان کا مفہوم یہ ہے کہ انسان خدا کی خدائی کا معتقد ہو۔ اور علم النفس میں یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ اعتقاد وہی ہے جس کے آثار انسان کے کردار و گفتار سے ظاہر ہوتے ہیں لہٰذا وہ ایمان ہرگز ایمان نہیں ہے جس میں بندے کے افعال خدا کے احکام سے بے پرواہ ہیں قرآن میں جہاں کہیں بھی اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (وہ لوگ جو ایمان لائے) کے الفاظ وارد ہیں ساتھ کے ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (اور انہوں نے نیک کام کئے) بھی موجود ہیں[۱]۔ اور جن آیات میں اٰمَنَ (ایمان لایا) کا تذکرہ ہے اسی کے بعد وَعَمِلَ صَالِحًا (اور نیک کام کیا) کی شرط بھی لگا دی ہے[۲] جس کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری

[۱] دیکھو سورہ رعد و شوری و مائدہ و فتح و ابراہیم و حج و یونس و بقرہ و محمد و ق و آل عمران و نساء و شعرا و نور و سجدہ و جاثیہ۔

[۲] سورۂ بقرہ و مائدہ و کہف و مریم و طہ و قصص و سبا۔

ایمان کافی نہیں ہے اسی کے ساتھ حسن عمل بھی لازم ہے۔ سورۂ نور میں ہے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۔ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ۚ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔ (سورہ ۲۴۔ رکوع ۷، آیۃ ۵۳)

اور انہوں نے اللہ کی بڑی پکی پکی قسمیں کھائیں کہ اگر حکم تو (بلا عذر گھر بار سب چھوڑ کر) باہر نکل کھڑے ہوں (ان سے کہو کہ) قسمیں نہ کھاؤ پسندیدہ فرمانبرداری چاہیے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی سب خبر ہے (یعنی جو ایمان کا مدعی ہو اس کو زبانی دعوے نہ کرنے چاہئیں بلکہ عمل سے اپنی ایمانداری کا ثبوت دینا چاہیے)۔

سورۂ حجرات میں ہے:۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۔ (سورہ ۴۹۔ رکوع ۲، آیۃ ۱۵)

ایمان دار توصرف وہ ہیں جو (۱) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر کسی طرح کا شک (وشبہ نہیں کیا) (۲) اور اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال سے کوشش کی (حقیقت میں) سچے یہی ہیں (یعنی جن لوگوں میں یہ دونوں شرطیں موجود ہوں ان کا ایمان تو سچا ہے اور جو ایسے نہ ہوں وہ جھوٹے بے ایمان ہیں)۔

یہ معیار ایمان اگر صحیح ہے اور ضرور صحیح ہے۔ تو ہم میں کتنے ہیں جو ایمان دار کہے جا سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے ایمان کے دعوے میں سچے ہوتے تو کیا یہ نہ دیکھتے کہ مسلمان کس روز بدیں گرفتار ہیں اسلامی دنیا پر نامسلمان کیوں کر غالب آتے جاتے ہیں۔ اور ہر ایک بر اعظم میں مسلمانوں کی کیا گت بن رہی ہے جہالت کی ہم کو شکایت ہے لیکن اس عمارت کی بنیاد خود ہمارے ہاتھوں سے پڑی ہے۔ قومی تنزل کا گلہ ہے مگر اس طوق کو ہمارے اعمال ہی نے گلوگیر بنایا ہے۔ ترقی کی خواہش ہے لیکن ایمان کا دل میں نشان تک نہیں۔ عزت و سربلندی کی تمنا ہے مگر عمل صالح سے بے پرواہیں گھر کی بضاعت ہے تو سود خواروں کے لئے وقف ہے۔ ذاتی آمدنی ہے تو بے اصول کاموں میں صرف ہو رہی ہے۔ وقت ہے تو رائیگاں جا رہا ہے نہ دماغ کی کسی طرح کی تربیت کی جاتی ہے۔ نہ دماغی و ذہنی قوتوں کے نشو ونما کے لئے تعلیم دی جاتی ہے۔ نہ قوم کی فلاح مطلوب ہے۔ نہ اخلاق درست ہیں

نہ درست کرنے کی فکر ہے۔ اور پھر ان بے اصولیوں کے ہوتے ہوئے ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور اسلام کے جو لوازم ہیں (یعنی ترقی و سربلندی) اُن کے خواہاں رہتے ہیں!!!

یہ سادہ دل بشارت قرآن سے شاد ہے　　مومن نہیں ہے انتم الاعلون یاد ہے

(۶)

بے شبہ قرآن کریم کا وعدہ سچا اور نہایت سچا وعدہ ہے کہ:۔

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا　　اور جو نیک عمل کریگا اور وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا تو اس کو نہ کسی طرح کے ظلم و ستم کا خوف ہوگا اور نہ کسی طرح کی حق تلفی کا۔

(سورہ طٰہٰ۔ رکوع ۶ آیۃ ۱۱۱)

لیکن اس وعدہ کے وفا ہونیکے لئے جو شرط کی گئی ہے کیا ہم اس پر بھی ملتفت ہونا چاہتے ہیں اور دل کو ایمان دماغ کو تہذیب نفس اور تمام اعضائے جوارح کو عمل صالح کا پابند بنانے پر آمادہ ہیں؟ ہمارے اخبار ہماری قومی حق تلفیوں کے شکوہ سنج رہتے ہیں، مظالم کے داد خواہ ہوتے ہیں، قوم کی تباہی کا مرثیہ سناتے ہیں اور تلافی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن سوچنے کی بات نہیں ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ہماری بدبختیوں کا نتیجہ ہے؟ مسلمان ایمان دار ہوں، نیک کردار ہوں تو نہ ان پر ظلم ہو سکتا ہے اور نہ ان کی حق تلفی ممکن ہے لیکن جب اس خصوصیت سے بیگانہ ہیں تو ظلم و ستم کا گلہ کیا اور حق تلفی کی شکایت کیوں؟ اے نور چشم من بجز از کشتہ ندروی!

(۷)

عمل صالح کا تعلق صرف ظواہر سے ہی نہیں ہے عمل صالح اگر ہے تو اخلاق کو مہذب رکھنا اور اعمال کو ایسے معیار تقویٰ پر لانا ہے جس سے خود اس کو اور اس کی قوم کو فائدہ پہنچے اور وہ فائدہ بھی منشائے قرآن کے مطابق ہو۔ جو تباہی ہم کو محیط ہے وہ اسی معیار کو نظرانداز کرنے سے لاحق ہوئی ہے۔ دنیا میں نظر کرو، دنیاوی ممالک پر نگاہ دوڑاؤ، جزائر یونان کو دیکھو، جزائر بحر روم کو دیکھو، سسلی کو دیکھو، سارڈینیا کو دیکھو، ہسپانیہ کو دیکھو، پرتگال کو دیکھو، جنوبی فرانس کو دیکھو، جنوبی

اٹلی لیبیا کو دیکھو۔ اور پھر بتاؤ کہ ان ممالک کے مسلمان کیا ہوئے اور کہاں گئے۔ الجزائر میں جاؤ جہاں آجکل فرانس کی حکومت ہے اور دیکھو کہ کیسی کیسی مسجدیں کلیسا کی شکل میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ بزرگوں کے مزاروں اور روضوں پر صلیبیں نصب ہیں اور مدرسوں اور خانقاہوں کے مشنری ہاوس بنے ہوئے ہیں۔ خود اسی ہندوستان کو دیکھو اور بتاؤ کہ قطب مینار جس فاتحانہ عظمت و سربلندی کی داستان سنا رہا ہے۔ تاج محل جس تمدن کا نوحہ خواں ہے۔ قوۃ اسلام جس جلالت و جبروت کی عزادار ہے جونپور کا پل اور قلعہ اور مسجدیں جس فر و شکوہ کی سوگوار ہیں احمد آباد و لاہور کی عبادت گاہیں جس دینداری کا ماتم کر رہی ہیں۔ وہ سب باتیں کیا ہوئیں اور کدھر گئیں۔ ہندوستان اب بھی وہی ہے لیکن اب وہ جاہ و جلال کہاں ہے جو محمد بن قاسم کے ساتھ آیا تھا۔ وہ فلسفہ کہاں ہے جس کی ملا محمود جونپوری نے بنیاد ڈالی تھی۔ وہ فلسفہ کی درسگاہیں کیا ہوئیں جو بہار و جونپور میں قائم تھیں۔ کیا ان سب کے فنا ہونے کا باعث یہی نہیں تھا کہ بزرگوں نے عمل صالح کا جو میراث چھوڑا تھا وہ برباد گیا اور ہم اس سے بے خبر ہیں۔ ہم اپنے اخلاق و عادات کو اگر مہذب بناتے اور مہذب رکھتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ دنیا ہماری غلام نہ ہوتی، اور زمانے پر ہمارا سکہ نہ بیٹھا رہتا۔ ہم ایک ریگستان (عرب) سے نکل کر اپنی اخلاقی طاقتوں کی بدولت ساری دنیا پر چھا گئے تھے۔ اب تقوی نہ ہونے کی وجہ سے ساری دنیا میں پھیلے بھی ہیں اور پھر بھی مٹی خراب ہو رہی ہے۔ عبرت پذیر دل کے لئے کیا یہ خون ہو جانے کی باتیں نہیں ہیں اور کیا اس انحطاط کی مصیبتوں میں بھی ہم کو خدا یاد نہ آئے گا۔ اور ہم اپنے ایمان و اخلاق کو محکم نہ بنائیں گے؟ بے شبہ ہم اب بھی ترقی کر سکتے ہیں۔ خدا نے جو وعدے کئے تھے وہ ابتدائی صدیوں کے لئے مخصوص نہ تھے وہ پاک و مقدس وعدے ہمیشہ کے لئے ہیں اور اب بھی ان کا دہی اثر ظاہر ہو سکتا ہے۔ دنیا ہمارے لئے ہے اور دنیا کی تمام علمی و اخلاقی و مادی و روحانی ترقیاں بھی ہمارے ہی لئے ہیں لیکن ان ترقیات کے لئے شرط کیا ہے؟ شرط محض اتنی ہے کہ ہمارے اخلاق و اعمال میں شائستگی و تہذیب و صلاحیت ہونی چاہئے یہی شرط اگلی قوموں سے بھی ہوئی تھی اور اسی کو خدا نے یاد بھی دلایا ہے کہ :-

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ　　وہ اگر توراۃ و انجیل کو قائم رکھتے (یعنی ان کے احکام کے پابند ہوتے)

وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ۔

مائدہ (۵) رکوع ۸۔ آیت ۶۱

اور وہ جو ان کے پروردگار کی جانب سے ان پر اترا ہے اسکی پیروی کرتے تو انھیں اتنی نعمت روزی ہوتی کہ اوپر سے اور پاؤں تلے سے کھاتے (یعنی ہر سمت ان کے لئے نعمت ہی نعمت ہوتی)

لیکن افسوس ہے کہ جس طرح ان اقوام نے اس شرط کو فراموش کر دیا وہی حالت آج ہماری ہے۔

کہ ایمان و عمل صالح کی پابندی پر ہم کو ترقی کی بشارت دی گئی تھی مگر ہم ہیں کہ دونوں کو بھولے اور نظر انداز کئے ہوئے ہیں اور پھر بھی ترقی کے متمنی ہیں کیا یہ کامیابی کی صورتیں ہیں اور کیا ایسی حالت میں ترقی ممکن ہے؟

قرآن مجید اور جرمنی

ترجمہ تقریر بیرن عمر رالف ایرن فلس

(۲)

اگر ہم اس بات کا یقین کر لیں کہ مشرق اپنے مذکورہ بالا مقصد میں کامیاب ہو جائیگا تو سب سے پہلے جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کے دماغ پر قرآنی تعلیمات میں سب سے زیادہ کونسی چیز اثر کریگی ؟

جرمن زبان بولنے والا ایک آسٹرین کی حیثیت سے میں یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ کم سے کم یورپ کا وہ حصہ جو جرمن بولتا ہے ، سب سے زیادہ قرآن کی اس تعلیم کی شگفتگی اور قابل عمل ہونے سے متاثر ہوگا جو وہ ہماری روح اور جسم کے ارتقا کے مابین اتحاد پیدا کرنے کے بارے میں دیتا ہے ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یسوع مسیح کی حیرت انگیز تعلیم کہ "حقیقتاً خدائی سلطنت تمہارے ہی درمیان ہے" وہی خیال ادا کرتی ہے جو قرآن کے وہ الفاظ ادا کرتے ہیں جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہم سے ہماری رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہے لیکن بدقسمتی سے عیسیٰ علیہ السلام کے ان الفاظ کو یہ مفہوم پہنا دیا گیا کہ خدا مانند انسان کے ہے جس کا مسکن آسمان کے اوپر ہے ۔ اگرچہ وہ انسان سے زیادہ شاندار اور مہربان خدا بھی ہے اور باپ بھی بخلاف اس کے قرآنی تعلیم نہیں بدلی بلکہ مختلف ادوار ارتقائی میں مختلف درجاتی معانی بیان کئے گئے ہیں اور بالآخر وہ لوگ جو خلوص کے ساتھ اس کے معانی کی تلاش میں کوشاں ہیں انکو ان الفاظ کا صحیح مفہوم یاد آجائے گا ۔ اسی خیال کو اسلام کے احکام میں مدنظر رکھا گیا ہے مثال کے طور پر عبادت کو لے لیجئے کہ قرآن مجید نے عبادت کے ساتھ ساتھ تقلب کو کس درجہ اہمیت دی ہے جس سے انسانی عمل اور انسانی تہذیب اور انسانی ذہنیت میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتا اپنے ساتھ ایک نئی روح سرایت کر جاتی ہے یورپ نے اپنی سائنس دانی کے زور سے فطرت کی بیرونی قوتوں پر حکومت کرنی سیکھ لی ہے ۔ اس طرح انسانی قوت حد سے

بڑھ کر نا قابل مقابلہ ہوگئی ہے لیکن ان بیرونی قوتوں کے ارتقار کے زمانہ میں انسان کی اصلی خوشی نے کچھ بھی ترقی نہیں کی مخفی قوتوں کے حاصل ہوجانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان قوتوں کا مالک ان کو اچھے اور مفید مصرف میں لائیگا لیکیں مالی جس کو دو بیلوں کی اس لئے ضرورت ہے کہ اس کا پانی کھینچیں اگر اس کو دو وحشی بیل دیئے جائیں جن کو وہ قابو میں نہیں لاسکتا اور وہ اپنی لڑائی سے اس کے باغ کے تمام پھول اور پودوں کو پامال کر ڈالیں تو اس کو کچھ فائدہ نہ ہوگا اگر وہ مالی ان کو رام کرے تو وہی بیل اس کے لئے بہت فائدہ مند ہوجائیں گے اس مثال سے آپ خود اندازہ کریں گے کہ یورپ میں اور خاصکر جرمنی میں ان قوتوں کی کیا حالت ہے جو انسانی قبضہ میں تو ہیں لیکن انکا استعمال موافق نہیں کیا جاتا۔ ہماری روح کی اندرونی اصلاح ہی ہماری روح اور ہماری زندگی کے مابین خوشگوار رابطہ پیدا کرسکتی ہے۔ اگر یہ خوشگوار رابطہ قائم ہوجائے تو ہماری موجودہ مشکلات سب کی سب آج ہی حل ہوجاتی ہیں کیونکہ موجودہ مشکلات صرف معاشی ہی نہیں ہیں بلکہ موجودہ تہذیب اور اس کے نظام کی پیدا کردہ ہیں۔

علاوہ اس عام حکم کے قرآن شریف ہمیں صاف طور پر اپنی اجتماعی زندگی کو تعمیر کرنے کے قوانین بتاتا ہے۔ وہ تخیلی اشتراکیت کی طرح انفرادی عمل کی خوبیوں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ کیا خوب بات ہے کہ بالشویک گورنمنٹ بھی عملاً اس قیمتی قوت کو نظر انداز نہیں کرسکی جو انفرادی جوش عمل کا باعث ہوتی ہے بخلاف اس کے قرآن کا صاف حکم یہ ہے کہ وہ لوگ جو دولت مند ہیں اور جو زیادہ دماغی قابلیت رکھتے ہیں اور جو جسمانی قوت میں زیادہ ہیں ان لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنے ان بھائیوں کی جو مالی یا ذہنی یا جسمانی اعتبار سے غریب اور کمزور ہیں مدد کریں اور ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اعلان کرتا ہے کہ یہ لوگ اپنے غریب بھائیوں کی ترقی اور اصلاح کے ذمہ دار ہیں اس بارے میں جو اساسی احکام ہیں ان کو ہر مسلمان جانتا ہے اور میں اس جگہ ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر قرآنی تعلیمات کو جرمنی تک پہنچا دیا گیا تو کیا وہ ان پر اس سے بہتر طریقے سے عمل پیرا ہوسکیگا جیسا کہ آج کل بعض اسلامی ممالک میں عمل ہو رہا ہے میں امید کرتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا کیونکہ جرمنی ہمیشہ ہر کام کو پوری طرح انجام دینے کا خوگر رہا ہے پس اسلام موجودہ زمانے کی شدید مشکلات پر حاوی ہونے میں ضرور معاون ثابت ہوگا۔

اسلام میں عورت کی حیثیت قرآن کی سچی تعلیم کے موافق اس سے بہت زیادہ اچھی ہے جو یورپ نے اس کو دی ہے یہ بات دوسری ہے کہ مقامی رسم و رواج اور رومی اور ایرانی اثرات کی بنا پر اور قرآنی حکم کو مختلف طور پر سمجھنے کی وجہ سے پردے کی رسم معاشرت میں داخل کر لی گئی ہے میں یہاں پر ایک آسٹرین نومسلم لیڈی بیرونس لطیفہ اسادسلر کی رائے بیان کرتا ہوں۔ وہ کہتی ہیں کہ قرآن شریف کی رو سے جو معاشی اور طلاق کے حقوق عورت کو حاصل ہوئے ہیں وہ ان حقوق سے اچھے ہیں اور عورتوں کے لئے مفید ہیں جو قبل جنگ یورپ کے قوانین نے عورت کو دئے تھے اور جو بعض ممالک میں اب تک رائج ہیں۔ مشرقی ممالک میں جو عمل قرآنی تعلیم کے خلاف ہوتا ہے۔ وہ دوسرا سوال ہے اور اس کو یہاں بحث میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب قرآن کی عملی تعلیم کا تیسرا سب سے زیادہ اہم حصہ قومی مسئلہ کا حل ہے جو ایک حیرت انگیز طور پر کیا گیا ہے صرف یہی نہیں کہ قرآن نے مختلف مسلم اقوام کو آپس میں منافرت کرنے سے منع کیا ہے بلکہ وہ غیر مسلم افراد اور اقوام سے بھی دل آزارانہ برتاؤ کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر اس پر بھی بس نہیں۔ مذہبی معاملہ میں قرآن نے صرف جبر و اکراہ ہی کو ممنوع قرار نہیں دیا بلکہ ہم مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ ان بے شمار پیغمبروں کو بھی مانیں جو ہمارے پیغمبر صلعم سے قبل ہر ملک اور ہر قوم میں مبعوث ہو چکے ہیں۔ چاہے وہ موسیٰ ہوں یا عیسیٰ بدھ ہوں یا کرشنا۔ یا چین کے لاؤسی ہی کیوں نہ ہوں یہی صحیح رواداری کا حیرت انگیز خیال ایک ایسا اطمینان بخش پیغام تھا جس نے مجھے یقین دلا دیا کہ اسلام بنی نوع انسان کے لئے ایک رحمت ہونے والا ہے صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ دوسرے پیغمبروں کے پیروں کے لئے بھی۔ (۳)

ان شاندار اور سب سے زیادہ اہم تعلیمات کے علاوہ قرآن ہماری پوشاک ہمارے فرنیچر اور ہماری تعمیرات کے بارے میں ایک ایسا نیا طریق زندگی بتاتا ہے جو اچھی طرح منظم ہے۔ سادہ ہے اور فطرت سے بالکل قریب ہے یہ تقریر بہت طویل ہو جائے گی اگر میں تفصیل کے ساتھ اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کروں کہ مشرق میں جو پوشاک اور دیگر رسوم رائج ہیں ان کی قرآن کس طرح مخالفت کرتا ہے اور کس طرح سادے اور تھوڑے کپڑے پہننے پر زور دیتا ہے جو جنوبی ممالک کی آب و ہوا کے عین مطابق ہے کیونکہ ان مقامات میں زیادہ کپڑے ایک ناقابل برداشت

بوجہ بن جاتے ہیں۔ لیکن جیسا میں نے کہا جرمن قرآن کے سمجھنے میں ان روایات کا ہرگز تتبع نہ کریں گے جو مشرق میں رائج ہیں بلکہ حقیقی قرآن ہی کی پیروی کریں گے میں یہاں بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ موجودہ انقلاب نے جرمنی میں ایسے رجحانات پیدا کر دئے ہیں جن کی وجہ سے جرمنی کے موجودہ طرز تعمیر اور فرنیچر اور پرانے عربی طرز میں مماثلت پیدا ہوگئی ہے (۴)۔

جہاں حالات اس امر کے موافق ہیں کہ جرمن قوم قرآنی تعلیم سے فائدہ اٹھائے وہاں اس امر کے امکانات بھی بہت کم ہیں کہ ان تعلیمات کو جرمنی تک پہنچایا جائے۔

اب تک قرآن شریف کے جرمنی میں متعدد ترجمے ہوئے لیکن ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کو کسی مسلمان اور جرمن زبان کے ماہر نے کیا ہو۔ اب تک جو ترجمے ہوئے ہیں وہ علم الالسنہ کے ماہرین نے اپنے مقصد کو پیش نظر رکھ کر کئے ہیں۔ یہ لوگ نہ تو اس کی مذہبی تعلیمات اور اس کے حقایق پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ اس قابل ہوتے ہیں کہ عربی متن کی خوبیاں ترجمہ میں ظاہر کر سکیں صرف ترجمہ کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ہماری کوشش تو یہ ہونی چاہئے کہ ترجمہ میں اصل کی خوبی اور روح ہاتھ سے نہ جانے پائے تا کہ پڑھنے والے کے دل پر پورا اثر ہو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے قرآن کا ترجمہ جرمنی زبان میں شروع کر دیا ہے۔ ہمارے دوست مولانا صدرالدین جو یہاں موجود ہیں اس کام کو ڈاکٹر منصور پی ایچ ڈی کی مدد سے کر رہے ہیں میں ترجمہ پر زبان کو بہتر کرنے کی غرض سے نظر ثانی کروں گا۔ یہ مقدس کام اس امر کا مستحق ہے کہ ہر مسلمان اس میں مدد دے۔ اور مجھے یقین ہے کہ کوئی سچا مسلمان اسلام کی ترقی میں مدد دینے سے حتی الوسع پیچھے نہیں ہٹے گا۔ اس اسلام کو مدد دینے سے جو ہم سب کو اس قدر عزیز اور پیارا ہے۔

بیرن عمر کی تقریر پر خیالات

از جناب ذوقی شاہ صاحب

اسلامی رواداری کے ثبوت میں بیرن صاحب دوسرے پیغمبروں پر ایمان لانے سے متعلق اسلامی ہدایات کو پیش کرتے ہیں اس سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ شائد اسلامی رواداری کے صحیح مفہوم سے ابھی تک آگاہ نہیں ہوئے تقریر مندرجہ بالا میں (TOLERATION) انگریزی لفظ (TOLERATION) کا ترجمہ "رواداری" کیا گیا ہے کسی خلاف طبع امر یا مخالف چیز کی برداشت کو کہتے ہیں۔ دیگر انبیاء کا وجود اور ان کی تعلیمات نہ اسلام کے مخالف ہیں نہ طبائع اسلامی کے خلاف موافق چیزوں کے ساتھ موافقت کو (TOLERATION) نہیں کہتے۔

اس سلسلہ میں ایک اور امر بھی قابل لحاظ ہے۔ دیگر انبیاء پر ایمان لانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو غلط تعلیمات ان انبیاء سے غلط طور پر منسوب کر دی گئی ہیں ان کو بھی مان لیا جائے۔ مثلاً ہر مسلمان عیسیٰ علیہ السلام کو نبی برحق مانتا ہے مگر کوئی مسلمان تثلیث کو تسلیم کرنے، اور اہل تثلیث کو اہل حق کہنے، اور تثلیث کی تعلیم کو عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب کرنے کے لئے از روئے اسلام آمادہ نہیں ہوسکتا۔ اسلامی رواداری کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ حق کو ناحق اور ناحق کو حق کہدیا جائے مومن کو کافر اور کافر کو مومن سمجھ لیا جائے۔ صالح اور فاسق میں کوئی امتیاز نہ برتا جائے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ایک بالکل دوسری چیز ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صراط المستقیم وہی ہے جس کی تعلیم قرآن پاک میں فرمائی گئی ہے۔ ہمارا جی یہ چاہتا ہے کہ ہمارے سب دوست ہمسائے ہم وطن، ہماری اس دنیا کے سب رہنے بسنے والے اس صراط المستقیم پر چلیں اور فائدہ اٹھائیں اس دنیا میں بھی سرسبز ہوں اور آخرت میں بھی سرخ رو ہوں ہم ہر ممکن تدبیر اور کوشش کرنے کے لئے بھی تیار ہیں کہ ایسا ہو اور سب ایک ہو جائیں مگر باوجود ان تمام جائز خواہشات کے ہم کسی کو بجبر مسلمان کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جبر و خوف کے تحت مسلمان بن جانے سے کوئی سچا مسلمان نہیں بن سکتا۔

اور جب تک کوئی دل سے اور برضا و رغبت اسلام قبول نہ کرے آخرت کے فوائد سے وہ محروم رہیگا اغیار کو بجبر مسلمان نہ بنانے کے یہ معنی نہ سمجھ لئے جائیں کہ ادیان غیر از اسلام کی حقانیت کے بھی ہم نعوذ باللہ قائل ہیں۔

(۴) اس سے اگر کوئی نتیجہ نکالا بھی جا سکتا ہے تو بس یہی کہ جرمنی ترقی کرتے کرتے اب اس منزل پر پہنچا ہے جس پر عرب صدیوں قبل پہونچ چکے تھے طرز تعمیر اور ذخیرہ وغیرہ میں تو صدیوں قبل کے عربوں سے مماثلت پر فخر کیا جاتا ہے لیکن تفسیر قرآن کے باب میں ان عربوں سے گریز اور جدت کی تلاش ہے کیا عجیب و غریب ذہنیت ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دانشمندان یورپ ابھی تک اسی محدود دنیا کے چکر میں مقید ہیں۔ مذہب کو صرف دنیوی معیار ہی سے پرکھتے ہیں اسلام کے صرف دنیوی مفاد ہی کو ٹٹولتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک وسیع تر اور بالاتر میدان میں ترقی کے لئے پیدا کیا ہے دنیوی مفاد تو محض ضمنی اور درمیانی اور عارضی چیزیں ہیں سچا مذہب انسان کی سفلی اور علوی دونوں ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ دونوں میدانوں میں ترقی کی شاہ راہ کو کھولتا ہے دنیوی سربزی کا بھی باعث ہوتا ہے اور آخرت کی نجات کا سامان بھی مہیا کرتا ہے ان دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے دونوں میدانوں میں کامیابی حاصل کرنا انسان کا فرض ہے یورپ ابھی تک صرف ایک ہی میدان میں ترقی کرنیکا خواہشمند نظر آتا ہے۔ دوسرے میدانوں سے بالکل غافل ہے حالانکہ کامل ترقی وہی ہے جس میں ہر پہلو کا اس پہلو کی اہمیت کی مناسبت سے خیال رکھا جائے۔ اگر انسان اپنے کسی ایک عضو کو نشوونما دیتے دیتے بہت زیادہ قوی کرے مگر بقیہ اعضا کو بیکار و معطل رکھکر بالکل بے حس کمزور اور مردہ بنا دے تو عضو قوی کی قوت کے باوجود اس شخص کو کوئی پورا انسان بھی نہ کہیگا چہ جائے کہ ترقی یافتہ انسان اسے سمجھے۔ یورپ کی ایک محدود دائرہ میں ترقی اس کے لئے کافی نہیں کہ اسے صحیح معنوں میں ترقی یافتہ کہا جائے۔ یورپ کی ان شدید خامیوں ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ باوجود اپنی حیرت انگیز سائنٹیفک ترقیوں کے وہ دنیا میں امن و عافیت و مسرت حقیقی پھیلانے میں کامیاب نہ ہو سکا جس کا بیرن عمر کو بھی اعتراف ہے یورپ کی یہ خامیاں اسی صورت میں دور ہو سکتی ہیں جبکہ یورپ قرآن مجید کو اسی طور پر سمجھنے کی کوشش کرے جس طور پر اصحاب رسول نے اسے سمجھا اور قرآن پر اس طریقہ سے عمل کرے جس طریقہ سے اس برگزیدہ جماعت نے اس پر عمل کیا

اگر یورپ نے بہت جلد ایسا نہ کیا اور اپنے ہی جہل مرکب پر اڑا رہا تو نتیجہ جو کچھ ہوگا وہ ارباب عقل و فہم پر ظاہر ہے

تصحیح

ماہ صفر کے ترجمان القرآن میں صفحہ ۱۱۱ سطر ۱۶ پر یہ فقرہ غلط چھپ گیا ہے۔ کہ "حق تعالیٰ ہر وقت کائنات کی جانب متوجہ رہتا ہے۔ اس متوجہ رہنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنی ذات وصفات سے کائینات پر متوجہ رہتا ہے" خط کشیدہ فقرہ دراصل یوں ہے کہ "اس متوجہ رہنے کے یہ معنی ہیں"

مجلہ مکتبہ

مذاکرۂ علمیہ

ایمان بالغیب اور مذہب تجدد

جریدۂ "نگار" کا تبصرہ اور اس پر ایک نظر

ماہ جون کے "نگار" میں حضرت نیاز فتحپوری نے "ترجمان القرآن" پر ایک مفصل تبصرہ فرمایا ہے جس کے لئے میں ان کا شکر گذار ہوں، اگرچہ عموماً رسائل و جراید کے انتقادات پر بحث کرنے اور ان پر جوابی نقد کرنیکا دستور نہیں ہے لیکن چونکہ ناقد فاضل نے اپنے تبصرہ میں بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جو ان کے مذہب تجدد کے مخصوص اصول و مبانی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی اصلاح کرنا "ترجمان القرآن" کے اولین مقاصد میں سے ہے اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان پر اظہار خیال کے پہلے موقع سے فائدہ اٹھاؤں۔

عبارت تبصرہ وہ لکھتے ہیں:-

> اس رسالہ کا مقصود اس کے نام سے ظاہر ہے، یعنی مطالب قرآنی اور تعلیمات فرقانی کو ان کی صحیح روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کرنا یقیناً اس مقصود کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن جیسا کہ خود فاضل ایڈیٹر نے ظاہر کیا ہے عہد حاضر میں اس مدعا کی تکمیل آسان نہیں۔ عہد ماضی میں جب مذہب نام صرف اسلاف پرستی و قدامت پرستی کا تھا کسی شخص کا مبلغ یا مصلح بن جانا دشوار نہ تھا لیکن اب جبکہ علوم جدیدہ اور اکتشافات حاضرہ نے "عمل خیال" کی بالکل ہی طرح ڈال کر حریت فکر ضمیر کی بدولت دماغوں کو مالا مال کردیا ہے

مذہب صرف اس دلیل کی بنیاد پر زندہ نہیں رہ سکتا کہ اس کے اسلاف کا طرز عمل بھی یہی تھا۔ اور وہ بھی وہی سوچتے تھے جو اب بتایا جاتا ہے۔

پہلے اگر خدا کی وحدانیت سے بحث کی جاتی تھی تو اب سرے سے خدا کا وجود ہی محل نظر بتایا جاتا ہے اگر پہلے ایک رسول کی ہدایت اس کے معجزوں سے ثابت کی جا سکتی تھی تو اب علوم منضاطیسیہ انہی معجزوں کی دلیل پر ہزاروں رسول و نبی پیدا کرنے کے لئے آمادہ ہیں پہلے ایک واعظ آسمان کی طرف دیکھ کر عرش و کرسی والے خدا کو پکار سکتا تھا، لیکن آج جب کہ آسمان ہی کوئی چیز نہیں رہا، ان کا ایسا کرنا کسی طرح مفید یقین نہیں ہو سکتا الغرض اب زمانہ "یومنون بالغیب" کا نہیں رہا بلکہ "یومنون بالتجربۃ والشہود" کا ہے اور ایسے نازک وقت میں کسی شخص کا مذہب کی حمایت کے لئے کھڑا ہو جانا آسان کام نہیں، جب کہ خود نفس مذہبیت کا خیال بھی اپنی جگہ چنداں قابل قبول نہیں

آگے چل کر وہ فرماتے ہیں:۔

قرآن پاک اپنے معنی کے لحاظ سے تین حصوں پر منقسم ہے ایک وہ جس میں اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ دوسرا وہ جس میں اعتقادات پیش کئے گئے ہیں اور تیسرا وہ جو قصص و تمثیلات پر مشتمل ہے حصۂ اول کے متعلق نہ زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی دلیل و برہان کے لانے کی کیونکہ تعلیم اخلاق تمام مذاہب کی تقریباً یکساں ہے اور ہر شخص یہ ماننے پر مجبور ہے کہ مذہب اسلام کی تعلیم دوسرے مذاہب کی تعلیم سے مختلف یا فروتر نہیں ہے البتہ حصہ دوم اور حصہ سوم پر زیادہ توجہ کرنا چاہئے، کیونکہ علوم جدیدہ اور اکتشافات حالیہ نے انہی دو حصوں کی طرف سے ریب و تذبذب کی کیفیت لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان شبہات کے دور کر دینے میں

کامیاب ہوجائے تو وہ اس صدی کا مجدد کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

اس لئے میں مشورہ دونگا کہ ایک مستقل باب اس موضوع پر قائم کرکے تمام ان آیات قرآنی کا استقصا کرنا چاہئے جو عقاید مخصوص کے متعلق ہیں اور ان کا مفہوم صحیح اور مدعا متعین کرکے ان اعتراضات کو دفع کرنا چاہئے جو اس وقت اہل علم و تحقیق کی طرف سے وارد کئے جاتے ہیں۔"

آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"آیندہ کے لئے میں ان کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ سب سے پہلے وحی و الہام کی حقیقت پر گفتگو کریں کہ اسی کے سمجھنے پر کلام اللہ کی حقیقت کا سمجھنا منحصر ہے اور پھر مسئلہ معاد کو لیں کہ اسی کے حل ہونے پر انحصار مذہبیت و لا مذہبیت کا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کلام آلہی اور معاد کا کیا مفہوم متعین کرتے ہیں اس کے بعد میں اپنے شبہات و اعتراضات پیش کرونگا اور اگر ان کی کوشش سے وہ دور ہوگئے تو مجھے بڑی مسرت ہوگی کیونکہ "ناچار مسلمان شو" کی جس لعنت میں بہت سے لوگ گرفتار ہیں، اس کا ایک سبب عقیدۂ معاد بھی ہے"

ماحصل فاضل معترض نے جن فرعی و جزئی مسائل کی طرف اشارات کئے ہیں ان کو چھوڑ کر میں صرف ان امور سے بحث کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق اصول سے ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کے مباحث کی تقسیم تین حصوں پر کی ہے لیکن ہم بآسانی ان کو صرف دو حصوں پر تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک وہ حصہ جس کا تعلق ان امور سے ہے جو ہمارے علم کی حدود سے باہر یا ہمارے ادراک کی سرحدوں ماورا ہیں جن کے متعلق ہم قطعیت کے ساتھ صحیح یا غلط ہونے کا کوئی حکم عقلی نہیں لگا سکتے اور جن میں قرآن ہم کو ایمان بالغیب لانے کی دعوت دیتا ہے اور دوسرے وہ امور جو ہمارے دائرۂ علم سے باہر نہیں ہیں، اور جن میں قطعیت کے ساتھ کوئی حکم عقلی لگانا ہمارے لئے ممکن ہے۔ پہلے حصہ میں وجود و صفات آلہی، فرشتے، وحی و کتب آسمانی، حقیقت نبوت

معبودِ حق

(مولوی ابو العطاء امجد دہلی)

دُنیا جس کے ارادے سے پیدا ہوئی ہے اُس کا ذکر فطرت میں منقوش ہے ہر شئی اپنے موجد اور خالق و مالک کی حمد و ثنا کرتی ہے۔ قرآن کریم نے اس راز کو ان خوبصورت الفاظ میں پیش کیا ہے۔ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ط وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ط سورۃ بنی اسرائیل رکوع ۵ جس کا مطلب یہ ہے کہ ساتوں آسمان اور زمین جو کچھ اُن میں ہے اُس کی توصیف و ثنا کرتے ہیں اور کوئی بھی شئی ایسی نہیں جو اپنی صورت و سیرت اور زبانِ حال و قال سے اُس واحد لاشریک اللہ کی تسبیح و تقدیس اور حمد و ثنا نہ کرتی ہو اگرچہ اُن کی اس حمد و ثنا کو ہم میں سے کوئی سمجھ نہیں سکتا۔

یہ ہے وہ امر جو فطرت میں منقوش ہے اور قرآنِ کریم کی خوبی کا یہ ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔

قرآنِ کریم نے معبودِ برحق خالقِ کل کا جو نام پیش کیا ہے وہ بجائے خود اپنے اندر اس امر کا مفہوم رکھتا ہے جو معبودِ برحق کیلئے ضروری ہے۔ علامہ رازی نے اپنی بے نظیر تفسیر کبیر کی جلد اول میں اس راز کو جس خوبی سے بیان فرمایا ہے اس کو کسیقدر یہاں پر بیان کردینا فائدہ سے خالی نہیں۔

تمام عرب اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام نے جو نام اللہ تعالیٰ کا پیش کیا ہے وہ کبھی اور کسی حالت میں اصنام کے لئے تجویز نہیں کیا گیا یعنے اسم "اللہ" ۳۶۰ بتوں کی پرستش کے جنون کے باوجود عربوں میں یہ نام بھی ذاتِ واحد کے لئے مخصوص تھا۔ اگرچہ بتوں کی محبت اور شوقِ پرستش نے اُس کی جانب سے بے پرواہی کی وبائے عام کو پھیلا دیا تھا۔

علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ "اللہ" در اصل "الاِلٰہ" تھا۔ الف۔ لام۔ تعریف خاص کا ہے

حریت فکر و ضمیر کی دولت سے دماغوں کو ایسا مالا مال کیا تھا کہ ان کے روشن زمانہ میں "یومنون بالغیب" کی
گنجائش ہی نہ تھی کیا بالکل یہی حالت دوسری صدی ہجری سے چوتھی صدی تک نہیں گذری ہے؟ افلاطون، ارسطو،
اپکیورس، زینو، تریلس، اسکندر افرودسی، فرفوریوس، فلاطینوس اور دوسرے علمائے فلسفہ و حکمت کے خیالات جب اسلامی
ممالک میں شایع ہوئے تھے اور ان کی بدولت فلسفیانہ تفکر اور عقلی اجتہاد کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا، تو کیا اس وقت بھی
ایک گروہ نے بالکل یہی نہ سمجھا تھا جو اب ایک گروہ سمجھ رہا ہے؟ کیا اس زمانہ کی "حریت فکر و ضمیر" اور عمل و خیال کی نئی طرح
نے اسی طرح لوگوں کو مذہبی معتقدات کی طرف سے ریب و شک میں نہ ڈال دیا تھا؟ مگر پھر کیا ہوا؟ فلاسفہ کے وہ بہت سے
نظری و قیاسی مسائل جن پر اس وقت کے لوگ ایمان لے آئے تھے، بعد میں غلط ثابت ہوئے وہ آفتاب علم جس کے سامنے
ان لوگوں کو مذہب کی شمع ٹمٹماتی نظر آ رہی تھی زمانہ کی ایک ہی گردش میں بے نور ہو کر رہ گیا، ان کے علوم جدید
فرسودہ ہو گئے، ان کے اکتشافات میں عمل و خیال کی نئی طرحیں ڈالنے کی قوت باقی نہ رہی اور جو طرحیں انہوں نے ڈالی
تھیں وہ سب پرانی ہو گئیں حتی کہ اپنے زمانہ کے اکتشافات پر کامل یقین و اذعان رکھتے ہوئے انہوں نے جو عقلی استدلالات
کئے تھے اور ان پر جن مذاہب حکمت کی بنیاد رکھی تھی ان میں سے اکثر کو آج ایک معمولی طالب علم بھی لغو و مہمل قرار دینے میں تامل نہیں کرتا
اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ گذشتہ زمانہ کی تاریکی میں مذہب کی شمع جل سکتی تھی مگر اب اس روشنی
کے زمانے میں نہیں جل سکتی، تو ہمیں بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے، کیونکہ جن چیزوں کو آج
علوم جدیدہ اور اکتشافات حاضرہ کہہ کر وہی دعوے کئے جا رہے ہیں جو پہلے کئے گئے تھے، ان کے متعلق بھی ہم کو یقین ہے کہ ان
میں سے بیشتر کا وہی حشر ہونا ہے، جو گذشتہ لوگوں کے "علوم جدیدہ" و "اکتشافات حاضرہ" کا ہو چکا ہے اور عمل و خیال کی یہ نئی
طرحیں بھی زمانہ کی گردش کے ساتھ پرانی اور فرسودہ ہو جانے والی ہیں، آپ ان تمام علوم و اکتشافات پر ایک غائر
نظر ڈالئے جو آپ کا سرمایۂ فخر و ناز ہیں، اور خود ان لوگوں سے جو ان علوم و اکتشافات کے اصلی محقق اور مکتشف ہیں دریافت
کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ گذشتہ علوم کی طرح ان میں بھی ایسے یقینیات بہت کم ہیں جن کے متعلق اعتماد کیا جا سکتا ہو کہ ان کے غلط ثابت ہونے کا
کوئی امکان نہیں ہے، باقی جتنی چیزیں ہیں سب ظنون، قیاسات، نظریات، ارتیابات اور تذبذبات ہیں جن کے متعلق یقین کے ساتھ کہا جا سکتا۔

ہے کہ ترقی کی جانب زمانہ کا قدم جتنا جتنا آگے بڑھتا جائیگا" یہ علوم جدیدہ" اور "یہ اکتشافات حاضرہ" قدامت کا لباس عاریتہً پہنتے جائیں گے اور عمل و خیال کی یہ نئی طرحیں جو ان ناپائدار علوم و اکتشافات کے بھروسہ پر پڑی ہیں، کچھ دوسری نئی طرحوں کے لئے جگہ خالی کرتی چلی جائیں گی۔

پس جب حال یہ ہے تو ایک ہوشمند اور بالغ النظر آدمی کے لئے محض اس چیز سے مرغوب ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اب "علوم جدیدہ" و "اکتشافات حاضرہ" نے "عمل و خیال کی نئی طرحیں ڈالدی ہیں" اور "حریت فکر و ضمیر" کی دولت سے دماغوں کو مالا مال کر دیا ہے لہذا اب خدا جانے مذہب کا کیا حشر ہو۔ وہ تو ان علوم و اکتشافات پر ایک تحقیقی نظر ڈالکر یہ دیکھے گا کہ ان میں جو چیزیں مذہب سے متصادم ہو رہی ہیں وہ یقینی بھی ہیں یا نہیں اگر وہ فی الواقع یقینیات ہوں اور مذہب کے حقیقی معتقدات سے متصادم بھی ہوں تو بلاشبہ اس کے لئے یہ سوال پیدا ہو جائیگا کہ مذہب پر ایمان لائے یا ان یقینیات علم پر۔ آئین تحقیق پر، لیکن اگر وہ محض قیاسات و نظریات ہوں۔ یا محض شک اور تذبذب میں ڈالنے والی چیزیں ہوں تو وہ ان کے اور مذہب کے تصادم سے ہرگز نہ گھبرائے گا کیونکہ مذہب کی بنیاد اگر یقین و اذعان پر ہے تو یقین و اذعان کے مقابلہ میں ظن و قیاس اور شک و تذبذب کو ہرگز کوئی ترجیح حاصل نہیں ہے۔ اور اگر وہ بھی ظنی و قیاسی چیز ہے تو اسی ظن و قیاس پر ان علمی نظریات کی بنیاد بھی ہے پھر دونوں میں موجب ترجیح کیا چیز ہے؟

علوم جدیدہ و اکتشافات حاضرہ سے مرعوب ہو کر مذہب کی طرف ایک ترمیم طلب نگاہ ڈالنا تو صرف ان لوگوں کا شیوہ ہے جن کے دل میں یہ تخیل گھر کر گیا ہے کہ ہر نئی چیز علم و اکتشاف ہے اور زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے اس کو قبول کر لینا یا اس پر ایمان لے آنا ضروری ہے۔ خواہ اس کی حیثیت محض قیاسی و نظری ہی ہو، اور خواہ اس کو انہوں نے گہری علمی بصیرت کے ساتھ نقد صحیح کی کسوٹی پر پرکھا بھی نہ ہو۔ ایسے ہی لوگوں میں "عمل و خیال کی نئی طرحیں" ڈالنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے ہمارا تجربہ ہے کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ عمل و خیال کی نئی طرحیں کیونکر پڑتی ہیں اور کونسی طرح جن جاتی ہے اور کونسی محض قصہ پارینہ؟ اسی طرح "حریت فکر و ضمیر کی دولت سے مالا مال" ہونے کا دعویٰ بھی ایسے ہی سطحی النظر لوگوں کا طرۂ امتیاز بنا ہوا ہے مگر بغیر معلوم نہیں کہ مجرد حریت فکر و ضمیر ایک فتنہ اور ایک خطرناک حالت ہے اگر اس کے ساتھ ایک وسیع اور پختہ علم اور گہری بصیرت نہ ہو۔

بالغ نظر، ایک متوازن اور صحیح الفکر دماغ نہ ہو، اور یہ وہ چیز ہے جس کو عطا کرنے میں قدرت نے اتنی فیاضی سے کام نہیں لیا ہے، جتنی آج کل فرض کر لی گئی ہے۔

ایمان بالغیب

دوسرا نظریہ جو اسی پہلے نظریہ سے نکلا ہے، یہ ہے کہ اب زمانہ "یؤمنون بالغیب" کا نہیں ہے بلکہ "یؤمنون بالتجربۃ والشہود" کا ہے۔ میں بہت غور کرنے کے بعد بھی نہیں سمجھ سکا کہ ان الفاظ سے قائل کا حقیقی مقصود کیا ہے۔ اگر مقصود یہ ہے کہ اس زمانہ میں کوئی ایسی بات تسلیم نہیں کی جاتی جس پر غیب کا اطلاق ہوتا ہو، اور جس کا تجربہ یا مشاہدہ نہ کیا گیا ہو، تو یہ بالکل غلط ہے۔ ایسا کہنے کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہوگا کہ اس زمانہ کے لوگوں نے صرف اسی حد کے اندر محدود رہنا قبول کر لیا ہے جس میں ان کا تجربہ و مشاہدہ ان کے لئے وسیلۂ اکتسابِ علم بن سکتا ہے، اور جس میں ان کے حواس کام دے سکتے ہیں، اور اس دائرے سے باہر جتنے امور ہیں ان کے بارے میں فکر کرنا اور قیاس و استقراء سے ان کے متعلق حکم لگانا اس نے چھوڑ دیا ہے۔ مگر کوئی شخص جس نے "علوم جدیدہ و اکتشافات حاضرہ" کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے، اس بیان کو تسلیم نہ کریگا۔ فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کو تو چھوڑیے جن کی بحث تمام تر امورِ غیب سے ہے، خود سائنس اور اس کے علومِ طبیعیہ کو لیجئے جن کے اعتماد پر آپ "ایمان بالتجربۃ والشہود" کا اعلان کر رہے ہیں۔ اس فن کا کونسا شعبہ ایسا ہے جس کی تحقیقات کا مدار قوت، انرجی، قانونِ فطرت، مادہ، رشتۂ علت و معلول اور ایسے ہی دوسرے امور کے اقرار و اثبات پر نہیں ہے؟ کونسا عالمِ طبیعی ایسا ہے جو ان چیزوں پر ایمان نہیں رکھتا؟ مگر کسی بڑے سے بڑے حکیم سے پوچھئے کہ ان میں سے کس کی حقیقت وہ جانتا ہے؟ کس کی کنہ تک اس کے حواس پہونچ سکے ہیں؟ کس کے نفسِ وجود کا تجربہ و مشاہدہ اس نے کر لیا ہے؟ اور کس کے موجود ہونے کا یقینی ثبوت وہ پیش کر سکتا ہے؟ پھر یہ غیب پر ایمان نہیں تو کیا ہے؟

ان الفاظ کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں صرف وہی بات مانی جاتی ہے جس کا تمام انسانوں نے تجربہ و مشاہدہ کیا ہے، اور جو نوعِ انسانی کے ہر فرد کے لئے شہود و حضور کا مرتبہ رکھتی ہے، لیکن یہ ایسی بات ہے جو کسی مردِ عاقل کی زبان سے نہیں نکل سکتی، اس لئے کہ یہ بالکل بدیہی امر ہے کہ تمام انسانی معلومات تمام افرادِ انسانی کو فرداً فرداً حاصل نہیں ہیں، بلکہ ان کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جس میں مخصوص جماعتوں اور مخصوص افراد کو اختصاص کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ ان خصوصی معلومات کا ہر شعبہ صرف اپنے مختص عالموں کیلئے حاضر اور باقی تمام انسانوں کیلئے غائب ہوتا ہے اور جمہور کو اس مختص جماعت کا ایمان بالغیب [illegible] مفہوم [illegible] تعبیر کا ایک یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ کا ہر شخص صرف وہی بات مانتا ہے جو اس کے ذاتی

تجربے یا مشاہدے میں آئی ہو، اور ایسی کسی بات کو نہیں مانتا جو خود اس کے لئے غیب کا حکم رکھتی ہو لیکن یہ ایسی بات ہے کہ اس سے زیادہ مہمل کوئی بات انسانی دماغ سے نکل نہیں سکتی اس صنعت کا کوئی آدمی کبھی پایا گیا ہے نہ آج پایا جاتا ہے، نہ قیامت تک اس کے پائے جانے کی امید ہے اور اگر وہ فی الواقع کہیں موجود ہے تو اس کی نشان دہی کرنے میں ہرگز تامل نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ تو اس کا مستحق ہے کہ عجائب عالم میں اس کا نمبر سب سے پہلا ہو۔

غرض آپ خواہ کسی پہلو سے اس فقرہ کو دیکھیں اس میں کوئی صداقت آپ کو نظر نہ آئے گی، خود تجربہ ومشاہدہ اس پر گواہ ہے کہ یہ زمانہ بھی اسی طرح یومنون بالغیب کا ہے جس طرح گذشتہ زمانہ تھا، اور ایمان بالغیب جس چیز کا نام ہے اس سے انسان کو نہ کبھی چھٹکارا ملا ہے، نہ مل سکتا ہے، ہر شخص اپنی زندگی کے ۹۹۹ فی ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ معاملات میں ایمان بالغیب لاتا ہے اور لانے پر مجبور رہے، اگر وہ یہ عہد کرلے کہ صرف اپنے تجربہ اور مشاہدہ پر ہی ایمان لائے گا تو اس کو معلومات کا وہ تمام ذخیرہ اپنے دماغ سے خارج کر دینا پڑیگا، جسے دوسروں پر اعتماد کرکے اس نے مقام علم ویقین میں جگہ دی ہے اور اکتساب علم کے ان تمام ذرائع کا مقاطعہ کر دینا پڑیگا۔ جو خود اس کے اپنے تجربہ ومشاہدہ سے ماسوئی ہیں، اور یہ ایسی حالت ہوگی جس میں وہ زندہ ہی نہ رہ سکے گا، کجا کہ دنیا کا کوئی کام کرسکے پس ایمان بالغیب کی کلی نفی، اور "ایمان بالتجربۃ والشہود" کا کلی اثبات نہ اس زمانہ میں ممکن ہے اور نہ اس سے بھی زیادہ روشن کسی اور زمانہ میں لامحالہ ہر زمانے اور ہر حالت میں انسان مجبور ہے کہ اپنے ذاتی تجربہ ومشاہدہ کے بغیر بہت سی باتیں محض دوسروں کے اعتماد پر مان لے کچھ باتیں اس کو خبر متواتر کی بنا پر ماننی پڑتی ہیں، جیسے کہ سنکھیا کھانے سے آدمی مرجاتا ہے درانحالیکہ ہر شخص نے نہ خود سنکھیا کھا کر اس کا تجربہ کیا نہ کسی کو کھا کر مرتے ہوئے دیکھا، کچھ باتوں کو ایک یا چند معتبر آدمیوں کی روایت سے مان لینا پڑتا ہے جیسے عدالتوں کا شہادت پر اعتماد، کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو قانون کی مشین ایک لمحہ کے لئے بھی حرکت نہ کرسکے کچھ باتیں صرف اس بنا پر تسلیم کرلینی پڑتی ہیں کہ انکو ایک ماہر فن کہہ رہا ہے۔ یہ حالت ہر مدرسہ اور ہر کالج میں ہر طالب علم پر گذرتی ہے اگر وہ اپنے فن کے اکابر علما وماہرین کی تحقیقات اور ان کے اکتشافات ونظریات پر ایمان بالغیب نہ لائے تو علم کے میدان میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، اور نہ کبھی ترقی کرکے اس مقام

تک پہنچ سکتا ہے۔ جہاں وہ خود ان علما و ماہرین کی طرح حقائق علمیہ کی تحقیق کرنے کے قابل ہو۔

اس سے ثابت ہوا کہ ہم ان تمام معاملات میں دوسروں پر ایمان بالغیب لاتے ہیں اور لانے پر مجبور ہیں جن میں ہم نے اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ سے اکتساب علم نہیں کیا ہے، اور دوسرے لوگوں نے کیا ہے۔ اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے اور اسی پر فیصلہ کا انحصار ہے کہ کس معاملہ میں کس پر ایمان بالغیب لانا چاہئے؟ اصولاً یہ بات ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ ایسے ہر معاملہ میں صرف اس شخص یا جماعت پر ایمان لانا چاہئے جس کے متعلق ہم کو یہ اطمینان ہو کہ اسے اس معاملہ کا بہتر علم حاصل ہے اور اس کے پاس اس کو جاننے کے بہتر ذرائع موجود ہیں۔ اسی قاعدہ کلیہ کے تحت ایک مریض ڈاکٹر کو چھوڑ کر وکیل سے مشورہ نہیں کرتا۔ اور ایک اہل مقدمہ وکیل کو چھوڑ کر انجینیر کے پاس نہیں جاتا۔ لیکن الٰہیات و روحانیات کے مسائل میں یہ اختلاف واقع ہوتا ہے کہ آیا ان میں علمائے فلسفہ و ماہرین علوم عقلیہ کی رائے تسلیم کی جائے یا عالم انسانی کے مذہبی و روحانی پیشواؤں کی؟ خدا اور ملائکہ، وحی و الہام، روح اور حیات بعد الموت، عذاب و ثواب آخرت اور ایسے ہی دوسرے امور غیب میں کانٹ اور اسپنسر، آئن سٹائن اور برگساں جیسے لوگوں کی بات مانی جائے، یا ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ و محمد علیہم السلام جیسے بزرگوں کی؟ "حریت فکر و ضمیر" کے مدعیوں کا رجحان پہلے گروہ کی جانب ہے، اور وہ انہی کی مہیا کی ہوئی کسوٹی پر دوسرے گروہ کی باتوں کو کس کر دیکھتے ہیں۔ جو باتیں اس کسوٹی پر کھری نکلتی ہیں انھیں مان لیتے ہیں، اس لئے نہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے کہی ہیں، بلکہ اس لئے کہ حکماء و فلاسفہ نے ان کو شرف قبول عطا کیا ہے (اور بدقسمتی سے ایسی باتیں بہت ہی کم بلکہ بالکل نہیں ہیں) اور جو باتیں اس پر کھوٹی نکلتی ہیں، ان کو غیر معتبر قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ برعکس اس کے "قدامت پرستوں" اور اسلاف پرستوں کا مسلک یہ ہے کہ نہ طبیعیات و عقلیات کی باتیں الٰہیات و روحانیات والوں سے پوچھو اور نہ اس کے برعکس الٰہیات و روحانیات کی باتیں عقلیات و طبیعیات والوں سے۔ دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں، اور ایک علم میں دوسرے علم کے ماہر کی رائے پر اعتماد کرنا پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ حکماء و فلاسفہ اپنے عقلی علوم میں خواہ کتنی ہی اعلیٰ بصیرت رکھتے ہوں، لیکن علوم الٰہیہ میں ان کا مرتبہ ایک عامی سے زیادہ نہیں ہے اور وہ ان کے متعلق معلومات کے اتنے ہی ذرائع رکھتے ہیں جتنے ہر معمولی انسان رکھتا ہے۔ یہ علوم مخصوص ہیں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ۔ وہی ان کے

ماہر ہیں اور انہی کے پاس ان کے جاننے کے اصلی ذرائع ہیں، اس لئے ان کے مسائل میں انہی پر ایمان بالغیب لانا چاہئے آپ کے لئے بحث وکلام کی گنجائش اگر ہے تو وہ صرف اس امر میں ہے کہ آیا وہ فی الواقع سچے اور علوم الٰہیہ میں صاحب بصیرت تامہ ہیں یا نہیں مگر جب یہ بات ثابت ہوجائے، یا ثابت کردی جائے کہ فی الحقیقت ایسے ہیں، تو پھر جو باتیں اپنی بصیرت اور اپنے علم کی بنا پر انہوں نے بیان کی ہیں وہ سب آپ کو ماننی پڑیں گی۔ ان سے انکار کرنا اور ان کے خلاف دلیل وحجت لانا بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے ایک اندھا سورج کے وجود سے انکار کردے اور آنکھوں والے کو جھٹلانے کے لئے وجود شمس کے امتناع پر دلیلیں پیش کرے۔ ایسا شخص اپنے زعم میں خواہ کتنا ہی بڑا فلسفی ہو مگر جو اپنی آنکھوں سے سورج کو دیکھ رہا ہے وہ اس نابینا کے متعلق جو کچھ رائے قائم کریگا اس کے بیان کی حاجت نہیں ہے۔

ریب وتذبذب کا اصلی علاج

آپ کہیں گے کہ انبیا علیہم السلام نے امورِ غیب کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کی تائید "علوم جدیدہ" و "اکتشافات حاضرہ" سے نہیں ہوتی، اور اس لئے لوگ "ریب وتذبذب" میں مبتلا اور "ناچار مسلماں شو کی لعنت میں گرفتار" ہوگئے ہیں۔ مگر میں کہوں گا کہ ان علوم واکتشافات میں وہ کونسے یقینیات ہیں جو اصول اسلام سے ٹکراتے ہیں؟ اگر ہیں تو وہ پیش فرمائیے تاکہ ہم بھی غور کریں کہ آیا قرآن کو مانیں یا علوم جدیدہ واکتشافات حاضرہ کو۔ اور اگر نہیں ہیں اور ہرگز نہیں ہیں جیسا کہ خود آپ کے الفاظ "ریب وتذبذب" "ناچار مسلماں شو" سے ظاہر ہوتا ہے تو پھر کیا علوم جدیدہ واکتشافات حاضرہ کے اسلحہ خانے میں صرف ظنیات وقیاسات ہی کے وہ ہتھیار ہیں جن کے بل پر وہ مذہب کے خلاف اعلان جنگ دے رہے ہیں، اور جن کی کاٹ نہیں محض چمک دمک دیکھ کر آج کل کے ارباب "حریت فکر وضمیر" یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ مذہب ان کا نام سنتے ہی سہم جائے گا۔ اور میدان چھوڑنے پر مجبور ہوجائیگا؟ آپ ان علوم واکتشافات کو خواہ کتنی ہی اہمیت دیں مگر یاد رکھیے کہ امور غیب میں وہ ہرگز مفید یقین نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ انکا یہ اثر ہوسکتا ہے کہ آپ "ریب وتذبذب" میں پڑجائیں اور کہیں کہ ہم وحی والہام، بعث بعد الموت یا عذاب وثواب آخرت یا فرشتوں کے وجود یا

خود خدا کے وجود کے متعلق نفیاً یا اثباتاً کوئی حکم نہیں لگا سکتے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ کو "ناچار مسلمان شو" کی لعنت سے نکالنے اور "کافر تواں شد" کی "برکت" سے مالامال ہونے میں یہ علوم کچھ بھی مدد دے سکیں کیونکہ امور مذکورۂ بالا سے قطعی انکار کر دینے کے لئے یہ علوم کوئی حجت فراہم نہیں کرتے، اور کسی چیز کے عدم کا حکم لگانے کے لئے صرف اتنی حجت کافی نہیں ہے کہ اس کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں ہے پس "ریب و تذبذب" کا مقام وہ آخری مقام ہے جہاں آپ کے "علوم جدیدہ" و "اکتشافات حاضرہ" آپ کو لے جا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر عقلی و ذہنی حیثیت سے یہ ایک بدترین مقام ہے اور جو علوم انسان کو یقین نہ بخش سکیں جو اسے ایک ایسے مقام پر معلق چھوڑ دیں جہاں اس کو کوئی جائے قرار نہ ملتی ہو، جو اسے "کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو" کی دلدل میں لیجا کر پھنسا دیں وہ یقیناً جہل سے بدتر ہیں اس مشکل سے اگر کوئی چیز انسان کو بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایمان بالغیب ہے۔ ایک دفعہ جب آپ نے ایک شخص کو نبی مان لیا اور یہ سمجھ لیا کہ وہ علوم الٰہیہ میں کامل بصیرت رکھتا ہے! اور یہ تسلیم کر لیا کہ وہ ہرگز جھوٹ نہیں بولتا، تو پھر آپ کے لئے امور غیب میں کسی تذبذب و ریب کی گنجائش نہیں رہتی، اور آپ کا اعتقاد یقین و اذعان کی ایک ایسی مضبوط بنیاد پر قائم ہو جاتا ہے جسے کسی "علم جدید" و "اکتشاف حاضر" اور "عمل و خیال" کی کسی "نئی طرح" اور "حریت فکر و ضمیر" کی کسی گرم بازاری سے کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں صاف تصریح کر دی گئی ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے متقین کے لئے اور متقین کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ ایمان بالغیب لاتے ہیں۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (۲:۱) اسی ایمان بالغیب پر مذہب کی پوری عمارت قائم ہے۔ اگر آپ نے اس اصل الاصول کو منہدم کر دیا تو پھر مذہب کے ان بنیادی معتقدات کے متعلق جن کی حقیقت معلوم کرنے کا خود آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے آپ کسی ایسی رائے پر نہیں پہنچ سکتے جس کی صحت کا خود آپ کو یقین ہو اور جس کی صداقت کا آپ دوسروں کو یقین دلا سکیں۔

نبوت کا مسئلہ بنیادی مسئلہ ہے

اب آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ایک شخص کے متعلق یہ دریافت کرنے کا کونسا ذریعہ ہے کہ وہ نبی ہے، اس کو علوم الٰہیہ میں کامل بصیرت حاصل ہے، اور وہ اس مرتبہ کا صادق

انسان ہے کہ اگر وہ امورِ غیب کے متعلق ہم کو ایسی باتیں سنائے جو ہماری عقل سے ماوراء اور ہمارے دائرہ علم سے باہر ہوں تب بھی ہم اس کی بات پر ایمان لے آئیں اور یقین کے ساتھ کہہ سکیں کہ وہ ہرگز جھوٹا نہیں ہے؟ اس سوال کا تصفیہ منحصر ہے دو چیزوں پر ایک یہ کہ ہم اس شخص کی ذاتی سیرت کو اس سخت سے سخت معیار پر جانچ کر دیکھیں جس پر کسی انسان کی سیرت جانچی جا سکتی ہے دوسرے یہ کہ ہم اس کی پیش کی ہوئی ان باتوں پر نگاہ ڈالیں جو ہمارے دائرہ علم سے باہر نہیں ہیں اور جن میں قطعیت کے ساتھ ایک حکم عقلی لگانا ہمارے لئے ممکن ہے جب ان دونوں امتحانوں سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اپنے صادق القول ہونے میں بے مثل ہے اور اس کے ساتھ زندگی کے تمام علمی اور فکری شعبوں میں خیر و صلاح و حکمت کی ایسی کامل تعلیم دیتا ہے جس میں انسانی عقل کہیں سے کوئی عیب نہیں نکال سکتی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کو سچا نہ مانیں اور یہ بدگمانی کریں کہ اس نے کسی علم و واقفیت کے بغیر محض دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے خدا اور فرشتوں اور عرش و کرسی اور وحی و الہام اور بعث بعد الموت اور دوزخ و جنت کا اتنا بڑا افسانہ گھڑ کر رکھ دیا ہے۔

پس حضرت نیاز کی تیسری غلطی یہ ہے کہ وہ قرآن کے پہلے حصہ کو (جسے ہم نے اپنی تقسیم میں دوسرا حصہ قرار دیا ہے) قابل بحث نہیں سمجھتے اور مزید برآں یہ خیال کرتے ہیں کہ اس معاملہ میں تمام مذاہب "تقریباً یکساں ہیں"۔ اور "مذہب اسلام کی تعلیم دوسرے مذاہب کی تعلیم سے مختلف یا فروتر نہیں ہے"۔ برعکس اس کے ہم کہتے ہیں کہ ان کی تقسیم کے مطابق قرآن کے دوسرے اور تیسرے حصے (یا ہماری تقسیم کے مطابق پہلے حصے) کی صداقت کا فیصلہ منحصر ہی اس پر ہے کہ ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور قرآن مجید کے ان تمام حصوں کی ناقدانہ چھان بین کریں جن کا تعلق امور غیب سے نہیں ہے۔ اور صرف اس پر اکتفا نہ کریں کہ اسلام کی تعلیم کا یہ حصہ "دوسرے مذاہب سے مختلف یا فروتر نہیں ہے" بلکہ بدلائل یہ ثابت کریں کہ وہ تمام ان مذاہب سے جو غیر اسلام ہیں، اعلیٰ و ارفع و اجمل ہے جب تک بحث کا یہ مرحلہ طے نہ ہو جائے۔ دوسرے مرحلے (یعنی امور غیب کی بحث) میں قدم رکھنا اصولاً غلط ہے، اور اس کے تصفیہ کے بغیر ان کا تصفیہ ممکن نہیں ہے۔

اصول بحث حضرت نیاز چاہتے ہیں کہ ہم "معاد" اور "کلام الٰہی" اور ان آیات سے بحث کریں جو عقاید و قصص سے تعلق رکھتی ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس بحث کے دو پہلو ہیں، اور وہ دو مختلف گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان ہی نہیں رکھتا اور اس بنا پر ان امور میں شک کرتا ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے جو آپ کی رسالت کو تسلیم کرتا ہے، مگر امور غیب میں اس کو شکوک و شبہات ہیں۔ ان دونوں گروہوں سے بحث کرنے کے طریقے مختلف ہیں، اور جب تک ہمیں معلوم نہ ہو کہ معترض کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے اس وقت تک ہم اس سے بحث نہیں کر سکتے

پہلے گروہ سے معاد اور کلام الٰہی اور دوسرے امور غیب پر بحث کرنا بالکل بے نتیجہ ہے کیونکہ اصل میں اختلاف رہتے ہوئے فروع پر بحث کر کے نتیجہ پر پہونچنا ممکن نہیں ہے۔ ہم معاد اور کلام الٰہی حتیٰ کہ خود وجود و صفات الٰہی کے متعلق بھی جن باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان پر ہمارا ایمان و یقین اس بنا پر نہیں ہے کہ ہماری عقلی تحقیق یا ہمارے ذاتی تجربہ و مشاہدہ نے ان کے متعلق ہم کو کوئی ایسا قطعی اور یقینی علم بخشا ہے، جس کے خلاف پر کوئی دلیل عقلی قائم نہ کی جا سکتی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ نبوت کی بحث سے بے نیاز ہو کر ان مسائل سے بحث کی جا سکتی تھی لیکن ان امور پر ہمارے قطعی ایمان و اذعان کی بنیاد تو اس اعتقاد پر ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم صادق القول ہیں! اور اپنی رسالت اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے متعلق جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اسی اصل سے یہ بات متفرع ہوتی ہے کہ محمد صلعم اور ان کے پیش کردہ قرآن نے امور غیب کے متعلق جو کچھ خبریں دی ہیں۔ وہ سب صحیح ہیں۔ پس جب تک محمد صلعم کی صداقت کے منکر سے ہم اس بنیادی مسئلہ کو تسلیم نہ کرا لیں گے، اس وقت تک کسی فرعی مسئلہ سے بحث ہی نہ کریں گے۔

رہا دوسرا گروہ تو اس کے اس حق کو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ وہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت تسلیم کرنے کے بعد امور غیب پر اس جہت سے کلام کرے کہ آیا قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ خبریں دی ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط؟ . . . .

اس لئے کہ یہ پہلو اختیار کرتے ہی وہ پہلے گروہ میں شامل ہو جائیگا۔ اگر وہ حقیقت میں دوسرے گروہ کا آدمی ہے تو اسے ماننا پڑے گا کہ قرآن کا لفظ لفظ صحیح ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ پیش کیا ہے غلطی سے مبرا ہے ۔ البتہ وہ اس پر دو پہلوؤں سے کلام کر سکتا ہے ایک یہ کہ آیا فی الواقع قرآن میں ایسا ہے یا نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے یا نہیں ؟ دوسرے یہ کہ قرآن اور سنت میں جو کچھ فی الواقع ہے اس کا صحیح مفہوم کیا ہے ؟

آخری گذارش آخر میں ایک بات مجھے اور عرض کرنی ہے۔ حضرت نیاز نے رائے دی ہے کہ ترجمان القرآن میں ایک باب المناظرہ کھولا جائے اور ارادہ ظاہر فرمایا ہے۔ کہ وہ اپنے شبہات و اعتراضات بھی پیش کریں گے جہاں تک اصطلاحی مناظرہ کا تعلق ہے میں نے ہمیشہ اس سے دامن بچایا ہے اور اب بھی بچانا چاہتا ہوں کیونکہ ایسی بحث کا میں ہرگز قائل نہیں ہوں جس کا مقصد محض دماغی ورزش یا عقلی کشتی ہو۔ رہا علمی مناظرہ، جس کا مقصد احقاق و تحقیق ہو، اور جس میں فریقین اس دلی خواہش کے ساتھ شریک ہوں کہ جو کچھ ان کے نزدیک حق ہے اس کا اظہار کریں گے، اور جو کچھ حق ثابت ہو جائیگا اس کو تسلیم کر لیں گے تو اس کے لئے میں ہر وقت آمادہ ہوں "نگار" میں جن شبہات و اعتراضات کو پیش کیا جائیگا۔ وہ بجنسہٖ "ترجمان القرآن" میں نقل کئے جائیں گے اور پھر جواب دیا جائیگا۔ اسی طرح امید ہے کہ ترجمان القرآن کے جواب پر اگر حضرت نیاز کوئی تنقید فرمائیں گے تو اصل جواب بھی اس کے ساتھ نقل فرمائیں گے تاکہ دونوں رسالوں کے ناظرین بحث کے دونوں پہلوؤں سے واقف ہوں، اور خود بھی کوئی رائے قائم کر سکیں صرف ایک پہلو پیش کرنا اور دوسرے پہلو کو پیش کرنے سے احتراز کرنا میرے نزدیک خود اپنی کمزوری کا اعتراف ہے ۔

افکار بشری کی آزادی میں قرآن کا حصہ

شیخ عبدالعزیز شاویش مرحوم کے خطبات

حصہ اوّل

آج چار پانچ سال قبل مصر کے مشہور فاضل شیخ عبدالعزیز شاویش مرحوم نے مدرسہ دارالعلوم قاہرہ میں عنوان مذکور پر چار خطبات دئے تھے جن کا ترجمہ صفحات ذیل میں درج کیا جاتا ہے ضروری نہیں ہے کہ شیخ کے تمام خیالات سے ہم متفق ہوں لیکن مجموعی حیثیت سے ہم خیال کرتے ہیں کہ شیخ نے جس پہلو سے قرآن حکیم پر نظر ڈالی ہے اس پہلو پر بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے۔ (ایڈیٹر)

حضرات!

غالباً یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ فکر بشری کی تحریک تحریر (آزادی) میں قرآن مجید کے اثر کو بیان کرنے سے پہلے میں آپ کے سامنے ایک مختصر تاریخی بیان پیش کروں جس سے معلوم ہو کہ ظہور اسلام سے پہلے دنیا کی بڑی بڑی قومیں کن انقلابات سے گذری ہیں اور اس کے بعد کئی صدیوں تک قوموں کی عقلوں میں کس قسم کا مدوجزر اور آزادی و غلامی کا الٹ پھیر رہا ہے، یہ بیان ہم کو اس بات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے میں مدد دیگا کہ قرآن نے عقل انسانی کو اس کا پورا پورا حصہ دلانے اور اسے اس مقام تک پہنچانے میں کس قدر حصہ لیا ہے جس تک انسان کے خالق نے روز آفرینش میں اس کا پہنچنا مقدر فرمایا تھا۔

سلطنت رومیہ (Roman Empire) کے عام سیاسی قانون کی بنیاد ادیان و عقائد اور افکار کی کھلی ہوئی آزادی پر تھی اور وہاں یہ حالت برابر قائم رہی تا آنکہ مسیحی مذہب یورپ میں داخل ہوا، اور اس کے ساتھ ہی روک ٹوک اور قیود اور بندشوں کا وہ دور شروع ہوا جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

قدیم زمانہ میں بعض شعراء یونان اور مذہبی پیشواؤں کے اثر سے لوگ خرافات اور رسوم اور تنگ نظری وتنگ دلی پیدا کرنے والے افسانوں کے جال میں پھنسے ہوئے تھے ان سے افکار کو آزاد کرانے میں سب سے زیادہ جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں ہرقلیتوس (Heracleitus) اور دیمو قریطس (Demoeritus) خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان دونوں نے مادہ طبیعیہ کی تحقیق و تفتیش کے بعد نفس بشری کے احوال اور سیاسی مسائل سے بحث کی، اور اپنی تمام کوششوں اور کاوشوں میں ایک ہی چیز کو اصل الاصول قرار دیا یعنی ہر شے کو عقل اور فکر کی کسوٹی سے پرکھنا یہی طریقہ انکساغورس (Anaxagoras) کا بھی تھا۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ یہ سورج جس کی تم صبح شام پوجا کیا کرتے ہو، یہ محض آگ کا ایک تودہ ہے، خدا نہیں ہے کہ اس کی پرستش کیجائے انسانی عقل کو اوہام کی بندشوں سے آزاد کرانے میں ان فلاسفہ نے جو کچھ کیا، اسی نے ان علماء تربیت کیلئے راہ صاف کی جو صوفیہ یا سفسطائیہ (Sophists) کے نام سے موسوم ہیں، جو پانچویں صدی قبل مسیح میں ظاہر ہوئے اور جنہوں نے قرن مذکور کے نصف ثانی میں اخلاق و سیاست کے نقطۂ نظر سے حیات اجتماعی کے قواعد و اصول وضع کئے اور خطا و صواب، عقل اور قوانین منطق و خطابت وغیرہ سے بحث کی۔ لیکن یہ سب باتیں ایک بہت ہی قلیل طبقہ علماء اور مفکرین کے طبقہ سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ رہے عوام، تو وہ ہر جگہ خرافات اور باطل عقاید کے دام میں اسیر تھے البتہ اس عہد میں ایتھنز (Athens) جس آزادی فکر اور سیاسی مسائل میں بحث و کلام کی حریت سے بہرہ مند تھا، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا خصوصاً ایتھنز کے زعیم حریت پریکل (Pericles) کے عہد میں کہ وہ آزاد مفکرین کا بڑا حامی تھا، اور اسی کی طاقت نے ایتھنز کے دیوتاؤں سے انکار کرنے والے فلسفی انکساغورس کو قانون کی گرفت سے بچایا اس زمانے کے واقعات و حوادث کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ادیان کے خلاف خروج کرنے والا سزا سے کبھی نہ بچ سکتا تھا اور اس مضمون میں جو کتاب شایع ہوتی تھی، اس کے نسخے جمع کر کے جلا ڈالے جاتے تھے اور انکی فروخت کو ممنوع قرار دیا جاتا تھا لیکن بے دین منطقیوں (Rationalists

کے خلاف جو منظم شورشیں اور باقاعدہ سختیاں پہلے ہوتی تھیں وہ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں کم ہونے لگیں جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اب ان لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور ان کا گروہ پھیلتا جا رہا تھا۔ یونانیوں اور رومیوں کے ہاں ان کی انتہائی علمی تمدنی اور مادی ترقی کے زمانہ میں جو قضایا مسلم تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مطلقاً مذہب عوام کے لئے نافع اور ضروری ہے جو لوگ حقیقت میں مذہب کے قائل نہ تھے وہ بھی سیاست عامہ کے ایک رکن کی حیثیت سے اس کے فائدے کے ضرور قائل تھے۔ کیونکہ ان کے فلاسفہ اکثر اس قسم کے عقائد اور نظریات کی اشاعت کا اقدام کر بیٹھتے تھے جو حیات اجتماعی میں اضطراب اور برہمی پیدا کرنے والے ہوتے تھے۔ یونانیوں میں سے جن لوگوں کا قدم اس میدان میں سب سے آگے تھا، ان میں ایک سقراط ہے، جو بجا طور پر ان علمار تربیت میں سب سے زیادہ جلیل القدر سمجھا جاتا ہے۔ جس چیز نے اس کو ممتاز اور یکتائے روزگار بنا دیا تھا۔ وہ یہ تھی کہ وہ نکتہ چینی اور مناقشہ کے طریق میں نہایت مضبوط تھا اور جو لوگ اس سے گفتگو کرتے یا اس کا کلام سنتے، ان کو اپنے زور تقریر سے اس نقطہ پر کھینچ لاتا تھا کہ معروف و مقبول عام عقائد کو بغیر جانچے پرکھے تسلیم نہ کریں، ان کو عقل و فکر کی کسوٹی پر کس کر دیکھیں رسوم و تقالید کی بند شوں میں بندھے نہ رہیں عوام کی خواہشوں اور رغبتوں سے بے پروا ہو جائیں اور ہر بحث و تحقیق کے لئے اپنے سینے کو کشادہ کرلیں۔ سقراط نے علم کی اشاعت اور تلاش حق اور فکر صحیح کے طریقوں کی جانب اپنے عہد کے نوجوانوں کی رہنمائی کے لئے یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا تھا کہ پانچویں صدی قبل مسیح کے وسط میں یونان ایک ایسی فکری حرکت کا میدان بنا ہوا تھا جس کی ابتدا کرنے والے یا تو پیٹ کا دھندا چاہتے تھے یا شہرت و ناموری کے طالب تھے۔ ان لوگوں نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے جدل اور تشکیک کے طریقوں میں غلو کی انتہا کر دی تھی، اور ان کو اس کی کچھ پروا نہ رہی تھی کہ ان طریقوں سے لوگ کس قدر گمراہ ہوں گے اور اس کے کیسے برے نتائج ظاہر ہوں گے ان لوگوں نے حق اور باطل، فضیلت اور رذیلت کو ایسا گڈمڈ اور خلط ملط کیا کہ لوگوں کے لئے صحیح اور غلط میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا، اور علم صحیح کے نشانات و حدود نگاہوں سے چھپ گئے انھوں نے

فکر ونظر کے شعبوں میں سے کوئی شعبہ اور معرفت کے میدانوں میں سے کوئی میدان نہ چھوڑا جس کے اساس وارکان میں تشکیک کے تیشے نہ چلائے ہوں نہ اس غرض سے کہ کسی علمی فائدے تک پہنچیں، یا صحیح نتائج حاصل کریں، بلکہ محض بھٹکنے اور بھٹکانے کے لئے محض جاہل بننے اور بنانے کے لئے۔

پس جب سقراط عقل رزیں رائے سدید اور علم صحیح لے کر آیا تو اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق کلام کرے اور انکی رہنمائی کے لئے اسی راستہ پر چلے جس پر دوسرے لوگ ان کو گمراہ کرنے اور ان کو بھٹکانے کے لئے چلتے تھے اگر وہ انکی تعلیم وارشاد میں ان راہوں سے الگ کوئی راہ اختیار کرتا جن کے وہ لوگ گرویدہ ہو چکے تھے، تو وہ نہ ان کو اپنے طریقہ کی طرف کھینچ سکتا اور نہ اپنے مقاصد میں کوئی کامیابی حاصل کر سکتا سقراط کے زمانہ تک تربیت عالیہ کو یونان کے سیاسیین اور مفکرین کے مقاصد میں شامل ہونے کا شرف حاصل نہ ہوا تھا، باوجودیکہ ایتھنز اس عہد میں اپنی جمہوریت اور رواداری اور آزاد خیالی کے لئے تمام دنیا میں مشہور تھا مگر تاریخ ہمکو حریت فکر کی طرف دعوت دینے والوں اور عقل سے فیصلہ چاہنے والوں کے خلاف اہل ایتھنز کے ظلم و ستم کی وہ وہ داستانیں سناتی ہے جن کے باور کرنے سے وہم انکار کرتا ہے سقراط مناظرہ و مجادلہ اور تشکیک و نقد کے فن میں بڑے درجہ کا ماہر تھا، اور لوگوں کے رسوم وعقائد کی پابندیوں سے اس کی آزادی مشہور تھی اس کے مقابلے میں یونانیوں کے اندر ایک ایسی روح کام کر رہی تھی جو جدید عقلی زندگی کی دشمن تھی، وہ فلاسفہ اور ان کے گرویدار سقراط سے جنگ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے جھوٹے قصے گھڑ کر ان کو بدنام کیا، ان کا مذاق اڑایا سقراط جیسے شخص کو زندیق، بدعمل اور گمراہی کی طرف بلانے والا مشہور کیا، یہاں تک کہ یونانی قوم اس کے خلاف بھڑک اٹھی اور اس کو ملحد اور نوجوانوں کے عقاید خراب کرنے والا قرار دیکر ۲۹۹ سنہ قبل مسیح میں قتل کر دیا اس پر نوجوانوں کے عقائد خراب کرنے کا الزام تھا۔ اس کو رد کرتے ہوئے اس نے دو باتیں پیش کی تھیں :۔

۱۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ جب وہ دیکھے کہ اس پر ظلم کیا جا رہا ہے تو اس کا مقابلہ کرے، خواہ نتیجہ مخالف ہو یا موافق اور یہ چاہے وہ ظلم کرنے والا کوئی صاحب اثر آدمی ہو، یا کوئی محکمہ ہو۔

۲۔ اپنی بات سے ہرگز نہ ٹلے کیونکہ آزاد مباحثہ میں بڑی مصلحت ہے اور یہی چیز علم صحیح کی ضامن ہے۔
اس کے ۷۰ برس بعد ارسطو کو بھی اسی انجام کے خوف سے ایتھنز چھوڑنا پڑا، کیونکہ وہاں اس کو بھی ملحد شمار کیا جانے لگا تھا۔

سقراط کے سب سے زیادہ جلیل القدر شاگرد افلاطون نے ایک نئی ضرب لگائی جس نے حریت فکر و مباحثہ کی جانب پیشقدمی کو رجعت سے بدل دیا۔ وہ اپنی مثالی ریاست (ideal state) میں لوگوں کو ایک خاص دین قبول کرنے پر مجبور کرتا ہے، جس کا خاکہ خود اس نے پیش کیا ہے، جو کوئی اس دین پر ایمان نہ لائے افلاطون اس کو قتل اور قید کی سزا دینا چاہتا ہے۔ وہ گفتگو اور مباحثہ کی آزادی کو بھی سزاؤں سے روکتا ہے جو اس نے اپنی کتاب میں تجویز کی ہیں۔

سقراط کی تعلیمات ایک ایسا سرچشمہ تھیں جس سے فلسفہ کے متعدد مذاہب رونما ہوئے اور فلاسفہ کا ایک ممتاز گروہ پیدا ہوا جن میں افلاطون اور ارسطو اور رواقیہ (Stoics) وغیرہ شامل ہیں جن کے مذاہب تیسری صدی قبل مسیح سے بلاد یونان کے اطراف میں پھیلنے شروع ہوئے، اور جنھوں نے عقلی زندگی کے دروازے کھول دیئے اور اہل یونان میں فکر و تدبر کی قابلیت پیدا کی۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل بیان ہے کہ گو ابیقورس (Epicurus) اس وجود میں تدبیر و تصرف کرنے والی خدائی حکومت کا منکر تھا، اور اس کی نظر مادہ اور مادیات کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکی تھی مگر اس کے باوجود وہ حدت فکر کی دشوار گذارگھاٹیوں سے اس حیرت ناک سرعت کے ساتھ گذرا کہ سوتی ہوئی عقلیں چونک پڑیں اور صدیوں تک زمانہ اس کے اثر کو نہ مٹا سکا حتیٰ کہ ایک رومی شاعر کو تو اس کے فلسفہ میں وحی و الہام کا جلوہ نظر آیا جس کو اس نے اپنے قصیدے "طبیعۃ الدنیا" نامی میں بیان کیا ہے۔

انسانی عقل کی آزادی میں رواقی فلسفہ کا بھی کچھ کم حصہ نہ تھا بلکہ درحقیقت اس مذہب نے ان قوانین اجتماعیہ کو ایک منظم اور مفصل طریق پر پیش کیا جن کا سقراط نے کچھ بھی ذکر نہ کیا تھا۔ رواقی فلسفہ نے رومی قوانین پر

خاص اثر کیا، کیونکہ رومی سلطنت کے قانون مدنی کی بنیاد تمام ادیان کی کھلی ہوئی آزادی اور اظہار رائے کی پوری حریت پر تھی، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

حضرات!

رومی سلطنت اسی آزادی فکر اور حریت دینی کے قانون پر چل رہی تھی کہ مسیحی مذہب یورپ پہنچا، اور رومی قوم نے اپنی صنم پرستی کی حفاظت کیلئے مذہبی آزادی کے اصول کو خیرباد کہدیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ رومی اس مذہب کو یہودیت کی ایک شاخ سمجھتے تھے، اور یہودیت بالطبع رومیوں کے دینی عقاید کی مخالف تھی اور رومیوں کو ایک آن نہ بھاتی تھی، یہودیت اور اس کے شبہ میں مسیحیت سے رومیوں کی شدید نفرت و بغض کا نتیجہ یہ ہوا کہ تراجان (Trajan) نے ان گوں کے قتل کا حکم دیدیا جو دین نصرانی کے پیرو تھے اگرچہ اس کے ساتھ ایسی قیود بھی عاید کردیں کہ حد سے زیادہ قتل عام نہ ہونے پائے لیکن بعد میں قیصر ڈیوکلیتیان (Diocletian) نے حکومت کے مذہب کی تائید کرنے کا عزم کرلیا اور پوری سنگدلی اور قساوت کے ساتھ مسیحیوں کا قتل عام کرایا، درحقیقت جس چیز نے اس فرمانروا کو ان جرائم پر آمادہ کیا وہ یہ تھی کہ مسیحیت رومیوں کی اس عبادت کی مخالف تھی جس کا مرکز رومن ایمپائر کا تخت تھا بخلاف اس کے رومی فرمانروا اس کو ضروری سمجھتے تھے کہ قومیں ان کو اپنی عبادت کے لئے مخصوص کرلیں تاکہ ان کی وحدت قومی باقی رہے اور اس تخت سے انکا خالص تعلق قائم رہے جو پوری سلطنت کا مرکز ہے۔

لیکن قسطنطین اعظم کے نصرانیت میں داخل ہوتے ہی نقشہ بدل گیا۔ اس سے پہلے دو صدیوں تک تو مسیحیت کے پیشوا یہ اعلان کرتے رہے تھے کہ مذہبی رواداری واجب ہے اور عقاید وہ چیز نہیں ہیں جو زبردستی انسان کے سر تھوپی جاسکتی ہو، قسطنطین کا مسیحیت میں داخل ہونا تھا کہ سرے سے یہ سب اصول پلٹ گئے، اب حکام اور فرمانروا بیشتر سیاسی اغراض کے لئے، اور عوام کے مختلف گروہ آپس کے مذہبی اختلافات کی بنا پر فتنوں کے شعلے بھڑکانے لگے جگہ جگہ ہولناک قتل عام برپا کرنے لگے، دنیا سے امن و سلامتی رخصت ہوگئی دلوں سے راحت و اطمینان کی متاع چھن گئی۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ نجات مسیحیت قبول کئے بغیر ہو نہیں سکتی، اور جو اس کو قبول نہ کرے اس کو کوئی فدیہ نہ عذاب جہنم سے

بچا سکتا ہے اور عذاب آخرت سے چاہے اس میں کیسے ہی فضائل ہوں اور اس نے کیسے ہی نیک کام کئے ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ اگر بچہ بپتسمہ لئے بغیر مرجائے تو وہ آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ پیٹ کے بل دوزخ کی زمین پر گھسٹتا رہیگا۔ ان کے مقدس ترین آدمیوں میں سے ایک سینٹ اگسٹائن (St. Augustine متوفی سنہ ۴۳۰ء) نے نصرانیت قبول نہ کرنیوالوں پر جبر و ظلم کرنے کے لئے ایک نظام مقرر کیا تھا جو اس کے بعد بارہویں صدی تک مسلسل چلتا رہا جب کبھی نصاریٰ کے درمیان کوئی بدعت رونما ہوتی یا کوئی ایسا عقیدہ نکلتا جو چرچ کے نفوذ و اثر کو کم کرنے والا ہوتا، تو اس عقیدہ کے پیرودں پر پادریوں کی طرف سے سختیاں کی جاتیں اور ان کو سزائیں دینے میں انتہائی مبالغہ کیا جاتا تھا، پوپ انوسنٹ سوم (Innocent) نے کونٹ طولوز کو حکم دیا کہ اپنی رعایا میں سے اس گروہ کا استیصال کردے جس پر مذہبی بدعت کا الزام تھا، اور جب کونٹ نے اس کا حکم نہ مانا تو پوپ نے اس کے خلاف صلیبی جہاد کیا جس میں اس کی قوم فنا ہوتے ہوتے رہ گئی، کونٹ کی املاک ضبط کی گئیں اس کی شوکت مٹادی گئی، اور پوپ نے اس سے اس وقت تک صلح نہ کی جب تک کونٹ نے اپنے ملک سے اس مذہب کا کلی استیصال کردینے کی شرط نہ مانی۔

اس طرح سنہ ۱۲۳۲ء میں ملحدین کی تحقیقات کے لئے نظام تفتیش (Inquisition) قائم کیا گیا اس کی تنظیم پوپ انوسینٹ چہارم کے عہد میں سنہ ۱۲۵۲ء میں مکمل ہوئی۔ تمام نصرانی ممالک میں سے پھیلا یا گیا پادریوں کو اس پر مفتش مقرر کیا گیا۔ پاپاؤں کی جانب سے ان کو مطلق اختیارات عطا کئے گئے جن کے استعمال میں ان سے کوئی باز پرس نہ کی جاتی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی نصرانی سلاطین نے بھی ملحدوں کو سزائیں دینے کے لئے سخت ظالمانہ قوانین مقرر کئے۔ باوجودیکہ فریڈرک دوم (Frederick) نہایت آزاد خیال شخص تھا لیکن اس نے بھی ایک حکم صادر کیا کہ جو کوئی نصرانیت میں کوئی بدعت نکالے، وہ دین سے خارج سمجھا جائے، اگر توبہ نہ کرے تو جلادیا جائے اگر توبہ کرے تو قید کیا جائے اور اگر توبہ سے پھر جائے تو قتل کردیا جائے اور بہر صورت ان سب کی املاک ضبط کی جائیں اور ان کے گھر ڈھادئے جائیں، ان کے بچے اور عورتیں تک رحم کے مستحق نہیں ہیں، اگر وہ ملحدین و مبتدعین کی مخبری نہ کریں (چاہے وہ ان کے باپ ہی کیوں نہ ہوں) تو ان کے ساتھ بھی وہی سختی کا برتاؤ کیا جائے۔ فریڈرک نے

الحاد اور بدعت کے لئے سولی کی سزا مقرر کی تھی یہ حکم اٹلی اور جرمنی میں ۵ اسال تک (سنہ ۱۲۲۰ء سے سنہ ۱۲۳۵ء) جاری رہا۔ پھر نظام تفتیش تمام مغربی یورپ میں پھیل گیا ہنری چہارم و پنجم کے زمانہ میں انگلستان میں بھی ملحد کی سزا سولی سے دی جاتی تھی، یہ قانون سنہ ۱۴۰۱ء میں جاری ہوا، سنہ ۱۵۳۳ء میں منسوخ ہوا پھر دوبارہ ملکہ میری کے عہد میں جاری کیا گیا اور سنہ ۱۶۷۷ء میں آخری مرتبہ منسوخ ہوا لیکن مسلمانوں اور یہودیوں کے خلاف بدترین وحشیانہ طریقوں کے ساتھ اس قانون کو برابر جاری رکھا گیا، اور اس کی قانونیت انیسویں صدی میں منسوخ کی گئی اس دوران میں یہ قانون ان مسلمانوں اور یہودیوں پر نافذ کیا جاتا تھا جن پر ارتداد کا الزام ہوتا تھا مختصر یہ کہ نظام تفتیش نے یہ قاعدہ کلیہ مقرر کر رکھا تھا کہ "سو بیگناہوں کا قتل کیا جانا اس سے بہتر ہے کہ ایک شخص الحاد کرے" اس قاعدہ کے مطابق وہ کم سے کم شبہ کی بنا پر بھی لوگوں کو قتل کرتے اور جلا ڈالتے تھے، اور کسی کو اپنی طرف سے مدافعت پیش کرنے کا حق نہ تھا، اور نہ کوئی محکمہ کسی حال میں تردیدی شہادت قبول کرتا تھا، چنانچہ پوپ انوسنٹ ہشتم نے سنہ ۱۴۸۴ء میں اعلان شایع کیا کہ طاعون اور آندھیوں کا آنا دراصل جادوگروں کے عمل کا نتیجہ ہے، لہذا ہر جگہ ان کو تلاش کرو اور جہاں ملیں بری طرح مارو اور قتل کرو۔ یہ حکم خصوصیت کے ساتھ انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ میں زیادہ زور کے ساتھ نافذ کیا گیا۔

بارھویں صدی کے آخر میں ایک دوسری دنیا نے اہل یورپ کی عقلوں کے لئے ایک نئی روشنی پہنچائی تاکہ انہیں ان بندشوں اور بندھنوں سے آزاد کرائے جن میں وہ جکڑی ہوئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی یورپ میں اہل عرب کے واسطہ سے فلسفہ ارسطو کی تعلیم پھیل رہی تھی، یورپ والوں کی عقلوں کو آزاد کرانے میں ابن رشد اور اس جیسے دوسرے فلاسفۂ اسلام کا بڑا حصہ ہے اور انکی تعلیمات کے اثر کو مٹانے اور ان کا مقابلہ کرنے میں پاپاؤں کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ پوپ یوحنا یازدہم ابن رشد کی تعلیمات کی سخت برائی کرتا تھا۔ اور اس کے وجود اور اسکی اشاعت کو حد درجہ مضر بتاتا تھا، جنوبی اٹلی میں سینٹ طامس اکون نے سنہ ۱۲۷۳ء میں ارسطو اور مسلمانوں کے فلسفہ کے مقابل کنیسہ کیلئے ایک فلسفہ ایجاد کیا جس پر آج تک رومن کیتھولک چرچ قائم ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے فلسفہ میں انسانی عقل کو کوئی جائے قرار نہیں ملتی

ایک ذرہ اسے ایک تنکے کی طرح ہوا میں اس طرح اڑائے لئے پھرتا ہے کہ کہیں وہ ٹھیر نہیں سکتا۔

مورخین کا اس پر اجماع ہے کہ حرکت فکری اور نہضت علمی یورپ میں بارہویں صدی عیسوی کے قریب دو راستوں سے داخل ہوئی: ایک تصادم جو دو صدیوں تک صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں فرنگی اقوام اور اسلامی مشرق کے درمیان ہوتا رہا، دوسرے وہ معاہد علمیہ جو عربوں نے اندلس، نیپلز اور صقلیہ میں قائم کئے۔ اور محقق مورخین یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ یورپ میں جن لوگوں سے نہضت علمیہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے، مثلاً راجر بیکن وغیرہ، وہ عربی زبان جانتے تھے اور لاطینی سے بھی واقف تھے جس میں قریب قریب فن کے متعلق عربوں کے علوم و مباحث منتقل ہو رہے تھے۔ جہاں کہیں ان لوگوں نے ایجاد و ابداع کے شرف کا دعویٰ کیا ہے، یا یہ شرف ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ انہوں نے عمداً وہ مصادر چھپائے ہیں جہاں سے مسائل انہوں نے اخذ کئے اور اپنے بنا کر پیش کر دئے۔ ائمۂ تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ انگریزی راہب راجر بیکن نے جس کی طرف اہل فرنگ عدسات و نظارات (Optics) میں سبقت کا شرف منسوب کرتے ہیں، یہ مسائل ابن الہیثم سے اخذ کئے تھے جو طبعیات اور خصوصاً نور اور بصریات کے مسائل میں اہم مباحث لکھ گیا ہے۔ پس وہ اہل قرآن ہی تھے جن کے ساتھ ربط و تعلق نے اہل یورپ کی آنکھیں کھولیں، ان کی بصیرت پر سے جہالت کے پردے ہٹائے، اور صدیوں کی چھائی ہوئی تاریکی سے ان کو نکالا۔ اگر مغرب کے باشندے اس وقت ہر حیثیت سے اسی مرتبۂ عقلی پر ہوتے جس پر اہل قرآن تھے، تو عربی تمدن اور اسلامی حریت فکر سے رابطہ قائم ہونے کے بعد ان کی فکری بیداری میں ذرا سی بھی تاخیر نہ ہوتی۔ لیکن اس زمانے میں مذہبی پیشواؤں کی گرفت ایسی مضبوط تھی اور مسیحی دنیا کی عقلیں کچھ اس طرح ان کی غلامی میں جکڑی ہوئی تھیں کہ اسلامی تمدن کے اثرات پوری قوت کے ساتھ آگے نہ بڑھ سکے۔ جو فلسفہ ان کے ہاں پہنچا اس کا رخ مذہبی پیشواؤں نے دینی مباحث کی طرف پھیر دیا، اور کنیسہ کی چار دیواری میں اس کو مقید کر دیا، اور اس طرح اس کی تحقیقات طبعی تک نہ پہنچنے دیا۔

سنہ ۵۲۹ء میں کیتھولک چرچ کی جانب سے اس مضمون کا جو فرمان جاری کیا گیا تھا، کہ تمام مجادلات

سے پرہیز کیا جائے، اور تورات و انجیل کی تفسیر بجز اس طریقہ کے کسی دوسرے طریقہ سے نہ کی جائے جو کنیسہ نے مقرر کر دیا ہے، اس نے نصرانی قوموں میں عام ناراضی پھیلا دی تھی اور یہ حکم منجملہ ان اسباب کے ایک بڑا سبب تھا جن کی بدولت پراٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوا لیکن اس کے باوجود اس پراٹسٹنٹ مذہب کے بانی لوتھر نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ حکومت قوم کو وہ عقیدہ اختیار کرنے پر مجبور کر سکتی ہے جسے وہ صحیح سمجھتی ہو، اور اسے حق ہے کہ ملحدین اور اس عقیدہ کا انکار کرنے والوں کا استیصال کر دے اسی قسم کے عقل کش قواعد و اصول تھے جنہوں نے ایک مدت تک حرکت فکریہ کو اپنی اصلی رفتار پر نہ چلنے دیا۔

آخرکار سولہویں صدی کے اواخر میں انگلستان کا فلسفی فرانسس بیکن ظاہر ہوا جس نے فلسفہ دینی پر زبردست حملے کئے اس کے عالیشان قصر کو دلائل کے تیشوں سے ڈھا کر رکھ دیا۔ لوگوں کو عقلی آزادی کی طرف دعوت دی، اور علمی مسائل پر جدید اسالیب سے بحث کرنے کی بنا ڈالی علمی تحقیق کرنے والوں نے اس کی رہنمائی کو قبول کیا اور اس وقت سے تجدید علمی اور تجرید عقلی کا وہ دور شروع ہوا جس کی ثمرات سے اب تک مشرق و مغرب متمتع ہو رہے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ یورپ میں تاریخ فلک جدید کی ابتدا سنہ ۱۵۴۳ء سے ہوئی ہے یہ وہ زمانہ ہے جب کوپرنیکس Copernicus کی کتاب شائع ہوئی جس میں اس نے سورج کے گرد زمین کا گھومنا ثابت کیا تھا، پھر گیلیلیو (Galileo) نے اپنی دوربین کے ذریعہ سے مریخ کے چاند ثابت کئے اور یہ بھی ثابت کیا کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے پھر کنیسہ نے ان اکتشافات کا استقبال کس طرح کیا؟ فروری سنہ ۱۶۱۶ء میں کنیسہ کی مجلس نے فیصلہ کیا کہ کوپرنیکس کا مذہب نہایت رکیک ہے، اور مسیح کی وصیت کے مطابق بدعتی ٹھیرایا گیا اور اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط تک روما نظام شمسی کی تعلیم سے محروم رکھا گیا اس ممانعت نے اٹلی میں علوم جدیدہ کی ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا اسی طرح پوپ الکزینڈر نے سنہ ۱۵۰۱ء میں مطابع پر نگرانی قائم کر دی تاکہ ایسے آزاد خیال جن کو کنیسہ پسند نہ کرتا ہو شائع نہ ہونے پائیں، چاہے وہ ثابت شدہ علمی حقائق ہی کیوں نہ ہوں۔ فرانسیسی

ہنری دوم نے اس شخص کے لیے قتل کی سزا مقرر کی تھی جو کوئی چیز بلا اجازت طبع کرے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے کسی حصہ میں پریس کو انیسویں صدی سے پہلے آزادی نصیب نہیں ہوئی یہی زمانہ ہے جس میں کنیسہ کا اقتدار ضعیف ہوا اور ملوک و امرار مدنیت کا اقتدار بڑھا اور دستوری نظم و قوانین کا چرچا ہوا۔ فرانس میں جب جمہوری حکومت قائم ہوئی (سنہ ۱۷۹۲ء) تو پاپا کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ کنیسوں کے خلاف ایک زبردست حرکت شروع ہوئی پیرس میں تمام معابد کو بلا استثنار بند کر دینے کا حکم دیدیا گیا۔ پھر جب روبس پیر (Robespierre) برسر حکومت آیا تو اس نے طے کیا کہ حکومت کا مذہب بزرگ و برتر کی عبادت ہو۔ اس کے تھوڑی مدت کے بعد ایک نیا دین ایجاد کیا گیا جس کا نام دین فطرت تھا، اور یہ اس صدی کے فلاسفہ اور شعرار مثلاً والٹیر (Voltaire) وغیرہ کا مذہب تھا۔ اس کے قواعد یہ تھے کہ خدا اور بقار روح کا اعتقاد رکھو، اور اخوت، وانسانیت و رحمت کو شیوہ بناؤ، ورنہ اس دین کی دوسرے ادیان و مذاہب سے کشمکش برپا ہوجائے گی۔ اس نئے مذہب کو دین محبت الہی (The philanthropy) کے نام سے موسوم کیا گیا۔ مگر سنہ ۱۸۰۱ء میں نپولین نے اس مذہب کا تختہ الٹ دیا اور پاپائیت دوبارہ میدان میں آگئی۔ اس حرکت سے نپولین کا مقصد بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ روحانی اقتدار سے فائدہ اٹھائے اور آیندہ کی لڑائیوں میں اس سے کام لے اور کیتھولک دنیا میں اپنی سلطنت وسیع کرے۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں بہت سی مسیحی جماعتوں کا عقیدہ اس وجہ سے متزلزل ہوگیا کہ اس زمانہ میں یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ تورات اور انجیل کے بیانات میں تضاد اور اختلاف ہے جس کو قبول کرنے سے عقل انکار کرتی ہے۔ اس سے انکار وحی کا خیال پیدا ہوگیا اور جگہ جگہ علمی مناقشات ہونے لگے انیسویں صدی میں قدیم رسوم و عقائد کے خلاف زیادہ منظم حملے ہوئے اور ان میں سے اکثر کی جڑیں اکھاڑ پھینکی گئیں اگرچہ اس زمانے کے علمار میں خود بھی باہم اختلاف تھا بعض کھلم کھلا ان تقالید کے منکر تھے اور ان کو غیر معقول اور رکیک سمجھتے تھے، اور بعض اس حد تک نہیں پہونچے تھے۔ فرانسیسی عالم پاسکل (Pascal

ان پر ایمان رکھتا تھا۔ انگریز فلسفی بیکن ظاہر میں لاہوتیت کا اعلان کرتا تھا۔ مگر دل میں الحاد چھپائے ہوئے تھا۔ دوسری طرف ڈیکارٹ (Rene Descartes) کوشش کر رہا تھا کہ عقل اور کنیسہ میں موافقت پیدا کرے۔ اس زمانہ میں بسا اوقات ہم کو کنیسہ پر عقل کا غلبہ علانیہ نظر آتا ہے۔ مثلاً جادوگروں کے معاملہ میں یا تو ہم دیکھ رہے تھے کہ ۱۶۱۲ء میں جیمز اول انجیل کی آیت "تو جادوگر کو زندہ نہ چھوڑ" کے مطابق عمل کر کے ان مسکینوں سے نہایت سختی کے ساتھ پیش آرہا ہے یا دوسری طرف ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ ہرٹفورڈشائر کی ایک جادوگرنی کو جیوری سزائے قتل کی مستحق قرار دیتی ہے مگر جج ان کی بات کو قبول نہیں کرتا اور کنیسہ کی تعلیمات اور عام رسم کو نظر انداز کر کے اسے رہا کر دیتا ہے اگرچہ انگلستان میں ساحر کے قتل کا قانون ۱۷۳۵ء میں منسوخ ہوا لیکن اس کے بعد بھی ۱۷۵۲ء میں اسکاٹ لینڈ کی ایک عورت اس الزام میں زندہ جلائی گئی۔

قابل ذکر مذاہب میں سے ایک وہ ہے جس کی بنا ہالینڈ کے یہودی فلسفی اسپینوزا (Spinoza) نے رکھی اس کا عقیدہ یہ تھا کہ عالم کا ایک خدا ہے جو اپنی ذات سے قائم ہے اور یہ کہ انسان اپنے ارادہ میں آزاد نہیں ہے اور علت اولیٰ یا علت العلل کا اعتقاد خرافات میں سے ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ وحدت الموجود یا وحدت الوجود کا اعتقاد رکھتا تھا۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ کلمہ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں آزاد مفکرین کے رموز میں سے تھا کیونکہ اس کی عام غضب اور تکفیر کا طوفان برپا ہو جاتا تھا اس کا اظہار صرف دقیق کتابوں ہی میں کیا جا سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں جتنے لوگ آزاد خیال کہے جا سکتے تھے وہ سب کے سب آہینین تھے، جو خدا پرستی کے تو قائل تھے مگر وحی کو نہ مانتے تھے۔

اسپنوزا کے معاصرین میں سے ایک لوک (Locke) ہے جس کی کتاب Essay on the Human understanding کا لب لباب یہ ہے کہ علم کلیۃً تجربات کا نتیجہ ہے۔ ہر حال میں اعتقاد کو حکم عقلی کے تابع ہونا چاہیے جو چیز حکم عقلی کے خلاف ہو اس کے ماننے سے انکار کر دو خواہ وہ وحی ہی کیوں نہ ہو۔ جو علم صحیح نظر عقلی سے حاصل ہوتا ہے وہ وحی سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس نے ایک کتاب نصرانیت کو عقل کے موافق بنانے کے لئے بھی لکھی تھی۔ اسی ڈھنگ پر اس کا

معاصر بائل بھی چلا جس نے فرانس سے جلاوطن ہونے کے بعد ہالینڈ میں اپنی کتاب القاموس الفلسفی Phylosophical Dictionary مرتب کی۔ وہ کہتا ہے کہ اعتقاد کی فضیلت بس اس میں ہے کہ خدائے واحد کی قدرت اور اس کی فرمانروائی پر ایمان رکھو" ایک اور موقع پر کہتا ہے کہ "الہیین کے لئے آرتھوڈوکس مذہب کے خدا کی صفات کو اس خدا کی صفات سے تطبیق دینا محال ہے جس کا وجود عقل سے ثابت ہوتا ہے" مگر جب آرتھوڈوکس لوگوں میں سے ایک فریق نے عقل کو حکم بنانا قبول کیا تو وہ گمراہ ہوگئے اور ان میں سے اکثر الحاد کے گڑھے میں جا پڑے۔ الہیین اور اسپینوزا اس امر میں متفق ہیں کہ آسمانی کتابوں کی تفسیر بھی اُسی طرح ہونی چاہئے جس طرح دوسری کتابوں کی ہوتی ہے۔

سترہویں صدی کے آخر تک الہیین کے خیالات پوشیدہ رہے، پھر جب قوانین مطبوعات منسوخ ہوگئے تو انھوں نے کچھ کچھ اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا۔ پوری آزادی اب بھی نہ تھی کیونکہ اب بھی چند مزاحمتیں باقی تھیں مثلاً مذہبی پیشواؤں کو حق تھا کہ جو کوئی مسیحی تعلیمات پر اعتراض کرے، یا ان کی تقالید کے خلاف رائے ظاہر کرے یا مسیح پر حرف گیری کرے اسے قید کردیں۔ انگلستان کے لارڈ چیف جسٹس ہیل (Sir Mathew Hale) نے سنہ ۱۶۷۶ء میں قانون عام کی یہ تعبیر کی کہ ہر وہ عمل یا قول جو کنیسہ کی تعلیم کے خلاف ہو قانون عام کے خلاف سمجھا جائیگا کیونکہ نصرانیت انگریزی قانون عام کے ارکان میں ہے سنہ ۱۶۹۸ء کے قانون عام میں یہ تصریح کی گئی کہ کسی نصرانی کے لئے کنیسہ کے اصول اور اس کی تعلیمات کے خلاف رائے ظاہر کرنا جائز نہیں ہے جو کوئی ایسا کریگا اس کو پہلی مرتبہ خدمت سے محرومی کی سزا دی جائیگی اور دوسری مرتبہ وہ عام مدنی حقوق سے محروم کردیا جائیگا۔

اٹھارہویں صدی میں والٹیر اور روسو (Rousseau) نے آزادی فکر کی تحریک کا بیڑا اٹھایا۔ موخرالذکر کی کتاب امیل (Emile) علانیہ پیرس میں جلائی گئی اور حکومت نے اس کے مؤلف کی گرفتاری کا حکم صادر کیا، تمام یورپ میں فریڈریک شاہ پروشیا کے سوا کسی نے اس کو پناہ نہ دی۔ مگر وہاں بھی مذہبی پیشوا اس کے پیچھے پڑے رہے یہاں تک کہ اسے پروشیا سے بھی نکلنے پر مجبور کردیا۔ روسو نے اپنی کتاب العقد الاجتماعی (Social Contract) میں جو اشتراکی نظریات بیان کئے ہیں ان کا حیات اجتماعی پر بڑا اثر ہوا ہے لیکن یہی کتاب اس نہایت

علانیہ جینوا میں جلائی گئی تھی،

۱۷۷۰ء میں جرمن بیرن دی ہولباخ (Holbach) کی کتاب نظام طبیعت (System of Nature) شایع ہوئی جس میں اس نے خدا کے وجود اور بقائے روح سے انکار کیا تھا تو تمام فرانسیسی ناظرین گھبرا اٹھے تھے غرض اٹھارہویں صدی میں گو اس تحریک کی مخالفت پوری قوت پر تھی لیکن الحاد اور آزاد خیالی اس کے علی الرغم پھیلتی چلی گئی۔

انیسویں صدی تک بھی مذہب و آزاد خیالی میں کشمکش برپا رہی چنانچہ ۱۸۱۹ء میں جب کارلائل کی کتاب عصر العقل (The Age of Reason) شایع ہوئی تو اسے تین سال کے لئے قید کی سزا دی گئی پھر اسی کتاب کی بدولت اس کی بیوی بیٹی اور بہت سے کتب فروشوں پر مقدمہ چلایا گیا۔

غرض اٹھارہویں صدی کے وسط تک اہل یورپ کی عقلیں قدیم تقالید کی بندشوں میں بری طرح جکڑی ہوئی تھیں اس زمانہ میں کیفیت یہ تھی کہ فریڈریک شاہ پروشیا کے باپ نے فیلسوف وولف (Wolfe) کو صرف اس جرم میں نکال دیا کہ اس نے کنفیوشس کے مذہب کی تعریف کی تھی گویا اس فرمانروا کی رائے میں کسی شخص کو نصرانیت کے سوا کسی مذہب کی تعریف کرنے کا حق ہی نہ تھا " مگر اسی باپ کے بیٹے نے اپنے ملک کو تمام ان لوگوں کے لئے جائے پناہ بنایا جو دوسرے ممالک میں حریت فکر کی بناء پر ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنکر بھاگتے تھے " ۱۷۸۱ء میں کانٹ (Kant) نے اپنی کتاب نقد عقل صحیح (Critic of Pure Reason) لکھ کر دنیا بھر میں ہلچل برپا کر دی اس نے رائے ظاہر کی کہ اس کائنات سے خدا کے وجود پر استدلال کرنا غلط ہے۔ اور بقائے روح پر جتنے دلائل قائم کئے گئے ہیں باطل ہیں اور دعویٰ کیا کہ علم کے لئے تجربہ کے سوا کوئی مصدر نہیں ہے لیکن آخر میں اس نے ایک اور کتاب لکھی جو الٰہیت کے انداز میں تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حیات اجتماعیہ میں اخلاق کے معیار کو برقرار رکھنا چاہتا تھا جس کے لئے بجز اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ ایک روحانی رنگ اختیار کیا جائے اور آسمانی مصادر سے استناد کیا جائے۔

مقتبسات

حدیث صحیح ہے کہ جب یہ آیت اتری کہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ (۶: ۹) یعنی جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کی آمیزش نہ کر دی تو انہی لوگوں کے لئے امن ہے اور وہی راہ راست پانے والے ہیں،، تو مسلمانوں کو اس سے بڑی تشویش ہوی اور انہوں نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہیں کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ بات نہیں ہے۔ دراصل وہاں ظلم سے مراد شرک ہے تم نے سنا نہیں کہ لقمان نے اپنے بیٹے سے کیا کہا تھا، یَا بُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰہِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (۳۱ : ۱۲) — بیٹا کسی کو خدا کے ساتھ شریک نہ کرنا کیونکہ شرک بہت ہی بڑا ظلم ہے، (رواہ الترمذی)

مسروق بن الاجدع روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ کے پاس تکیہ سے لگا بیٹھا تھا آپ نے فرمایا کہ اے ابو عائشہ (یہ مسروق کی کنیت تھی) تین باتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی ان میں سے ایک کا بھی قائل ہو تو اس نے اللہ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔

ایک یہ کہ کوئی گمان کرے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے رب کو دیکھا ہے۔ ایسا گمان کرنے والا خدا پر افترا باندھنے والا ہے، کیونکہ خدا قرآن میں خود فرماتا ہے لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (۶ : ۱۰۳) — نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ وہ بڑا باریک بین، و باخبر ہے" اور وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ

حجاب (۴۲ : ۵) "کسی بشر میں یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے بجز اس کے کہ یہ کلام وحی کے طور پر ہو یا پردے کے پیچھے سے"۔ یہ سن کر میں تکیے سے ہٹ کر سیدھا ہو بیٹھا۔ اور میں نے کہا کہ اے ام المومنین جلدی نہ کیجئے۔ ذرا مجھ کو بھی کہنے کا موقع دیجئے۔ کیا اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا ہے کہ ولقد رآہ نزلۃً اخری (۵۳ : ۱۳) "اور وہ حقیقت وہ اس کو ایک اور دفعہ بھی دیکھ چکا ہے" اور ولقد رآہ بالافق المبین (۸۱) "اور بیشک اس نے آسمان کے مطلع صاف میں اس کو دیکھا ہے"۔ اس پر حضرت عایشہ نے جواب دیا کہ سب سے پہلے میں نے ہی ان آیتوں کا مطلب رسول اللہ صلعم سے پوچھا تھا۔ آپ نے فرمایا اس سے مراد جبرئیل ہیں۔ ان کو میں نے ان کی اصلی صورت میں جس میں کہ اللہ نے انھیں پیدا کیا ہے صرف انہی دو موقعوں پر دیکھا ہے میں نے ان کو آسمان سے اترتے دیکھا۔ ان کی بناوٹ کا بڑا حصہ آسمان اور زمین کے درمیان کی فضا پر چھا گیا تھا،

دوسرے یہ کہ کوئی گمان کرے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان باتوں میں سے کسی چیز کو چھپایا جو ان پر اللہ نے نازل فرمائی تھیں۔ ایسا کہنے والا اللہ پر افترا باندھنے والا ہے۔ اللہ تو فرماتا ہے کہ یا ایھا الرسول بلّغ ما انزل الیک من ربک (۵ : ۱۰) "اے رسول تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ نازل کیا گیا ہے اس کو پہنچا دو"۔

تیسرے یہ کہ کوئی گمان کرے کہ رسول اللہ یہ جانتے تھے کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ ایسا گمان کرنے والا بھی خدا پر بڑا افترا باندھنے والا ہے۔ خدا تو فرماتا ہے۔ لا یعلم من فی السموٰت والارض الغیب الا اللہ (۲۷ : ۵) "جتنی مخلوقات زمین و آسمان میں ہیں، ان میں سے کوئی بھی غیب کا علم نہیں رکھتا۔ یہ علم صرف اللہ کو ہے"۔ (رواہ ترمذی)

حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں تنگ دستی کی مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اس پر آپ نے اپنی ازواج

مطہرات کے پاس آدمی بھیجا، مگر ان کے پاس کچھ نہ ملا پھر آپ نے فرمایا کہ کیا کوئی ایسا نہیں ہے جو آج رات اس کی ضیافت کرے اللہ اس پر رحمت نازل فرمائے گا۔ یہ سن کر انصار میں سے ایک شخص اٹھا اور اس نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ میں اس خدمت کے لئے حاضر ہوں" پھر وہ اپنے گھر گیا اور اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مہمان ہے۔ تو کوئی چیز بچا کر نہ رکھ" اس نے کہا خدا کی قسم میرے پاس بچوں کی خوراک کے سوا کچھ نہیں ہے" انصاری نے جواب دیا کہ" اگر بچے رات کو کچھ کھانا چاہیں تو ان کو بہلا کر سلا دینا اور اٹھ کر چراغ بجھا دے ہم آج رات کو بھوکے سو جائیں گے" چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ دوسرے دن صبح کو وہ انصاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ عز وجل کو فلاں مرد اور فلاں عورت کی بات بہت پسند آئی پھر اللہ عز وجل نے یہ آیت نازل فرمائی وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۹: ۱) وہ خود اپنے نفس پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، خواہ وہ خود تنگی میں ہوں۔ اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے بچا لیا جائے تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ (رواہ البخاری)۔

حضرت جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ایک تجارتی قافلہ جمعہ کے دن آیا ہم سب لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں تھے ایک دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت خطبہ دے رہے تھے قافلہ کی خبر سنتے ہی ۱۲ آدمیوں کے سوا سب لوگ اٹھ کر چلے گئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَیْهَا وَتَرَکُوْكَ قَآئِمًا، قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ (۶۲: ۲) اور جب انہوں نے تجارت یا کھیل تماشا دیکھا تو جھٹ کر ادھر چلے گئے اور تجھ کو کھڑا چھوڑ دیا۔ ان سے کہہ دے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے سے بہتر ہے اور اللہ بہتر روزی دینے والا ہے۔ (رواہ البخاری)۔

علقمہ کی روایت ہی کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا کہ "اللہ کی لعنت ہو گودنا گودنے والیوں اور گدوانے والیوں پر اور چہرے کے بال اکھاڑنے والیوں پر اور حسن کی خاطر دانتوں میں جھریاں نکلوانے والیوں پر، اور ان پر جو اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو بدلیں"، یہ بات بنی اسد میں سے ایک عورت نے سنی جس کا نام ام یعقوب تھا۔ وہ حضرت عبداللہ کے پاس آئی اور بولی کہ "میں نے سنا ہے آپنے ایسا اور ایسا کرنے والیوں پر لعنت بھیجی ہے" حضرت عبداللہ نے کہا کہ "میں کیوں نہ اس پر لعنت بھیجوں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے، اور جس کو کتاب اللہ میں کہا گیا ہے؟ اس نے کہا کہ "دونوں تختیوں کے درمیان جو کچھ ہے (یعنی قرآن) اس کو تو میں نے پڑھا ہی مگر اس میں مجھے وہ چیز نہیں ملی جو آپ کہتے ہیں" حضرت عبداللہ نے جواب دیا کہ "اگر تو نے اس کو پڑھا ہوتا تو یہ بات تجھے مل جاتی کیا تو نے یہ نہیں پڑھا کہ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (۵۹: ۱) جو کچھ رسول تمھیں دے اسے لے لو اور جس سے وہ تمھیں منع کرے اس سے باز آجاؤ؟ اس نے کہا ہاں۔ حضرت عبداللہ نے کہا "تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے"۔ اس نے کہا "میں تو دیکھتی ہوں کہ آپ کے گھر کے لوگ ایسا کرتے ہیں، حضرت عبداللہ نے کہا تو جا کر دیکھ لے چنانچہ وہ گھر میں گئی اور دیکھا۔ مگر اسے کوئی بات اپنے مطلب کی نہ ملی تب حضرت عبداللہ نے کہا کہ اگر میری بیوی ایسا کرتی تو میں کبھی اس سے نہ ملتا، (رواہ البخاری)۔

نقد و نظر

اصلاح المسلمین

تالیف مولوی سید محمد ادریس صاحب تحصیلدار پنشنر تاج گنج - آگرہ قیمت ۴؍

اس مختصر رسالہ میں مولف نے عقائد اور اخلاق اور عبادات اور معاملات کے متعلق قران مجید کی آیات کا صرف ترجمہ الگ الگ عنوانات کے تحت جمع کر دیا ہے۔ مثلاً صفات الٰہی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف بعث و نشر اور یوم آخر کے متعلق جتنی آیات ہیں ان کا ترجمہ ان عنوانات کے تحت ایک جگہ لکھدیا ہے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی آیات کا ترجمہ الگ الگ سلسلہ وار لکھدیا ہے۔ اور اخلاق و معاشرت اور معاملات کے متعلق جدا جدا عنوانات قائم کرکے ان کے بارے میں جو آیات ہیں ان کے تراجم یکجا جمع کر دیے ہیں۔ عام مسلمانوں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہے کہ اس طرح قران حکیم کے احکام اور اس کی تعلیمات پر مجملاً اتنی اطلاع حاصل ہو جاتی ہے جتنی ایک عامی کے لئے ضروری ہے۔

بشریٰ

ماہوار رسالہ زیر تحریر مولوی عبد الرزاق صاحب فاضل دیوبند و مولوی ابو الجلال صاحب ندوی - مقام اشاعت ۱۳۱ کتابت خان اسٹریٹ - مونٹ روڈ - مدراس قیمت سالانہ تین روپئے۔

ایک مذہبی تاریخی اور علمی رسالہ ہے۔ مختلف مذاق کے مضامین اس میں جمع کرنیکی کوشش کی گئی ہے مدراس جیسے مقام میں زبان اردو کی یہ ایک مفید خدمت ہے جنوبی ہند کے لوگوں کو اس رسالہ سے فائدہ اٹھانا اور اسے ترقی دینے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

نرخنامہ و قواعد اشتہارات

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	۱۰ عـہ	۲۵ عـہ	۴۵ عـہ	۸۰ عـہ
نصف صفحہ	۶ ـے	۱۵ عـہ	۲۵ عـہ	۴۵ عـہ
ربع صفحہ	۴ ـے	۱۰ عـہ	۱۶ عـہ	۲۵ عـہ

(۱) کوئی خلاف شریعت یا خلاف تہذیب اشتہار شایع نہ کیا جائیگا۔

(۲) اشتہار کی اشاعت سے پہلے اجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

(۳) صرف وہی چربے قبول کئے جائینگے جو اس رسالہ کی وضع و ہیئت کا لحاظ رکھ کر تیار کئے گئے ہوں۔

(۴) نرخنامہ میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کی جائے گی۔

(۵) ٹائیٹل کے صفحات کی اجرت عام نرخنامے کی بہ نسبت ۲۵ فیصدی زیادہ ہوگی۔

قواعد

رسالہ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینہ کی ۵ اتاریخ کو شایع ہوا کرے گا۔ مہینہ کی ۲۵ تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھکر منگوا سکتے ہیں۔ ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینہ کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہونگی ان کو پرچہ قیمتہً دیا جائے گا۔

رسالہ کی موجودہ قیمت میں کسی قسم کی رعایت ممکن نہیں ہے۔ لہذا کوئی صاحب رعایت کا مطالبہ نہ فرمائیں۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیئے۔ لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لئے مضامین اور حل طلب شکوک تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں۔ لیکن اڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر مضمون شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن

خیرت آباد (حیدر آباد دکن)